...روی تازہ اور بلند پایہ مط...

شعاعیں

مرتبہ شبلی بی کام۔ ہندوستان کے پندرہ مرد افسانہ نویسوں کے شاہکار:۔

شرر پھول، نئے چہرے، مصور، نیم سوختہ سگار، زوال اور ٹرمینس جیسے پندرہ کی تعداد میں افسانے ہیں مجلد معہ گردپوش۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ

مشاہیر کے رومان

مصنفہ عبدالرحیم شبلی بی کام

دُنیا میں سب لوگوں کی زندگی میں رومانی لمحات آتے ہیں شہنشاہ اور فاتح سلاطین اور بادشاہ شہزادے اور حکمران، شہزادیاں اور بیگمات، مشاہیر اور اکابر کے رومان مطالعہ کرنے ہوں تو اِس کتاب کو پڑھ جائیے۔ بقول فراق گورکھپوری اِس کتاب میں ایک باب، ایک صفحہ، ایک پارہ، ایک سطر اور ایک لفظ بھی آپ محبت کی رنگا رنگ دلچسپیوں سے خالی نہ پائیں گے۔ ایکدفعہ کتاب ہاتھ میں لیکر ختم کئے بغیر چارہ نہ ہو گا۔ کتاب مجلد ہے اور گردپوش پر ہٹلر، اشوک اعظم، سٹالین، مسولینی اور نپولین وغیرہ کی تصاویر ہیں۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ۔

قلوپطرہ کی ایک رات

مترجمہ عبدالرحیم شبلی بی کام۔

فرانسیسی کے طویل ترین افسانوں کا ترجمہ جو اپنی طرزِ بیان اور دلکشی کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتا شبلی صاحب کے ترجمہ میں جو روانی اور مصنف کی روح کا صحیح اور مکمل عکس ہے اسکو ملک کے نامور ادیبوں نے سراہا ہے۔ مجلد معہ گردپوش قیمت دو روپیہ چار آنہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔

خوشبوئیں

مرتبہ: عبدالرحیم شبلی بی کام۔

ہندوستان کی مشہور افسانہ نویس خواتین کے

بیس ... ترقی پسندانہ شاہکار۔ اِس مجموعہ میں ... اور ہولناک شب جیسے افسا...

چہرے

جو ...

ہر افسانہ نئے رومان ... ہیں۔ کتاب مجلد ... روپیہ چار آ...

دُنیا کے بہترین ناول

مترجمہ ... احسان ...

(آمرز) یورپ کے نامور ادیب ایڈمنڈ گائیڈ اور سمرسٹ ماہم کے شہرہ آ... انگریزی ناولوں کا اُردو ترجمہ جو مشہور ادیب احسان بی۔ اے نے کیا ... کتاب مجلد ہے اور گردپوش سے مزین ہے۔ قیمت تین روپیہ محصول ڈاک ...

پھول اگتا ...

... ادبی دُنیا ... افکار اور ...

ترجمہ مترجم ... قیمت ایک روپیہ ...

مغرب کے ... افسانے

... اس مجموعہ میں اُن مشہ... افسانہ نگاروں کے شاہ... شامل ہیں جو دُنیا کے ... ترین ... مجموعہ۔ مجلد گردپوش ... علا...

کھیل

... نشتر ... لگائے گئے ہیں۔ پڑھیں ... دو روپے (...

مینیجر ادارہ ادبیاتِ جدیدیہ گلرو...

شاہکار

اگست ۱۹۴۸ء

اردو ادب کے جدید تعمیری اور تخلیقی رجحانات کا ترجمان

ماہنامہ

شاہکار

ایڈیٹر
محمد آصف

جلد نمبر ۲۳   اگست ۱۹۴۸ء   نمبر ۲

پاکستان و ہندوستان کے ریاستی
محکمہ ہائے تعلیم میں منظور شدہ۔
محکمہ تعلیم پنجاب میں منظور شدہ

ادارہ ادبیات جدید مسلم سٹریٹ سرکلر روڈ لاہور

سالانہ چندہ پانچ روپے   فی پرچہ ۱۰ آنے

فہرست مضامین

افسانے

اشتہارات

چوہدری فضل حق پرنٹر پبلشر نے انصاف پریس ریلوے روڈ لاہور سے چھپوا کر رسالہ "شاہکار" مسلم سٹریٹ سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔

سالنامہ شاہکار کے متعلق حضرت چغتائی کی رائے

راوی روڈ۔ لاہور

مکرمی یوسف صاحب۔ السلام علیکم

میں کوئی چار پانچ ماہ سے حیدرآباد میں تھا۔ آپ کا پرچہ اکثر ملتا رہا۔ واپسی پر آپ کا ایک خاص نمبر مارچ اور اپریل کا ملا۔ اس پرچے کو ترتیب دینے میں آپ نے پہلے سے بھی زیادہ محنت کی ہے۔ موجودہ دور میں ادب کی خدمت انجام دینا ایک معجزہ ہے۔ خدا کرے کہ پاکستان اپنی روایات کا ثبوت دے ...... مجھے صرف یہ کہنا تھا کہ آج کل ... ادبی اور فنی زندگی کا ثبوت دینا بہت بڑی بات ہے جس کی مجھے قدر ہے ..... زبان کے دو ٹکڑے یہ مضمون اتنا اہم اور ...... موجودہ سیاست پر ایک ایسی ضرب کاری ہے بقول مصنف شبلی صاحب یہ زخم پچاس سال میں بھی بھر نہ آئیگا۔ میرے اپنے خیال میں بھی ۱۹۴۷ء کی ترقی اردو کو صدیوں کے بعد بھی نصیب نہ ہوگی۔ والسلام

آپکا مخلص۔ عبدالرحمن چغتائی

فکر و نظر

مدیر

شاہکار کا موجودہ شمارہ شاہکار کا زیر نظر پرچہ بجائے ۲۰×۳۰/۸ کے ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر شائع کیا جا رہا ہے اور حجم میں بھی ۲ کاپیوں کا یعنی ۳۲ صفحات کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ صرف ایک جدت پیدا کرنے کے لئے شاہکار کا سائز تبدیل کیا گیا ہے۔ ۲۰×۳۰/۸ سائز اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس میں کوئی کشش اور انفرادیت باقی نہیں رہی۔ شاہکار کا موجودہ شمارہ کتابی سائز کے ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اس میں تنوع ہے اور پڑھنے کا مواد بھی کافی ہے یورپ اور امریکہ میں اس سائز پر کثرت سے رسائل شائع ہوتے ہیں جو بہت پسند کئے جاتے ہیں یورپ کا مزاج تخلیقی اور جدت پسند ہے اس لئے وہاں پر نئے تجربہ کی قدر کی جاتی ہے اور اس کے لئے تجارتی اور علمی حلقوں میں ایک گنجائش پیدا ہو جاتی ہے لیکن ہمارے ہاں ان صفات کا فقدان ہے صرف تقلید کو پسند کیا جاتا ہے اگر شاہکار کا موجودہ سائز قارئین شاہکار کے تقلیدی جذبہ کے لئے ایک بار ثابت ہوا تو پھر اسے پہلے ہی سائز پر شائع کیا جائے گا اور اگر شاہکار کا یہ سائز مقبول ہوا تو اسے مستقل کر دیا جائے گا —— کوشش کی جا رہی ہے کہ شاہکار میں تصاویر

چھاپی جائیں اور موجودہ اور قدیم مصوّروں کے شاہکاروں پر معلوماتی اور تنقیدی مضامین بھی شائع کئے جائیں۔ اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی ممالک میں ادب کی رفتار پر مستقل عنوان کے ماتحت باقاعدگی سے ایک نہایت جامع مضمون شائع ہوا کرے، ان دو مستقل عنوانوں کے اضافہ سے امیّد ہے شاہکار کا معیار بہت بلند ہو جائے گا۔

ہمارے ادیب | "ہمارا ادب" لکھنؤ فروری ۴۲ء میں میراجی کا ایک مضمون "عوام کا ادب" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:۔

" اس کے قطع نظر اگر ہم جدید شعراء کے کلام کو بھی دیکھیں تو ان کی شاعری کو الگ چھوڑتے ہوئے جو یکسر مغربی ادب کے پروردہ ہیں زیادہ تعداد ایسے ہی لکھنے والوں کی ہے جن کے پاس کوئی نمایاں اور اچھوتا خیال نہیں ہے شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ آجکل کے ادیب یا شاعر کی تخلیقات میں دو بڑے دھارے دکھائی دیتے ہیں ایک سیاسی اور اقتصادی اور دوسرا سماجی یا جنسی آج ہمارا ادیب جب اپنے آس پاس ہوتے ہوئے ظلم کو دیکھتا ہے تو بیساختہ لوگوں کی خوشحالی اور آسودگی کے لئے پکار اُٹھتا ہے لیکن اکثر اسکا بیان ساختہ ہوتا ہے یا اس کے خیالات کو اپنے ملک کے مذاہب اور تمدّن و تہذیب سے ہم آہنگی حاصل نہیں ہوتی اسلئے اس کا کہا موثر اور کارگر نہیں ہوتا۔"

میراجی نے موجودہ ادیبوں کی ذہنی ساخت کا بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی

ہے کہ ہمارے ترقی پسند ادیبوں میں اپنی قوم اور ملک کے ثقافی ورثہ کا معمولی سا بھی احساس موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عوام کے مزاج کو نہیں سمجھتے اور ان کے اجتماعی، عمرانی اور تمدنی تقاضوں کی ترجمانی نہیں کرتے اور ان کا کہا موثر نہیں ہوتا۔ اس فقدانِ احساس کے پیش نظر میں نے سالنامہ شاہکار میں یہ لکھنے کی جرأت کی تھی:۔

" کیا یہ ترقی پسند ادیبوں کی انتہائی ستم ظریفی نہیں کہ انہوں نے ہندوستانی سماج کے صدیوں پرانے بے لچک دائروں اور ہندوازم اور اسلام کی دو متضاد تصویروں سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف معاشی مساوات کی تبلیغ کی، یہ ہمارے ادیبوں کے عدم التفات اور شدت احساس کے فقدان کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ انقلابی رد جو آل انڈیا کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاسی جدوجہد اور عوام کے سیاسی شعور کے نتیجہ میں پیدا ہوئی سمٹ کر ثقافتی سانچے میں ڈھل گئی اور ملک کی وحدت کو پاش پاش کر گئی، اور اس سے ایک خطرناک سیاسی اور جغرافیائی خلیج پیدا ہو گئی جس کو صرف فطرت کا طبعی عمل ہی پاٹ سکتا ہے ہمارے ترقی پسند ادیبوں سے کہیں بڑھکر قرن وسطیٰ کے ریفارمر کبیر اور نانک ہی بالغ نظر تھے جنہوں نے ہندوستان کے عمرانی مسئلہ کو بغیر سائنس اور منطقی اسلوب کی مدد کے صرف صوفیانہ تجربہ سے محسوس کیا تھا ہمارے ادیبوں کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں بسنے والی دو قوموں کے مزاج عقلی کو سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی اور نہ اس مزاج عقلی سے پیدا ہونیوالی تمدنی ثنویت پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی مستقبل کا ادبی مؤرخ جب

اس زمانہ کے ادب کو غور سے مطالعہ کرے گا تو وہ اس دور کے ادیبوں کی سطحیت اور تغافل کو دیکھکر سر پیٹ لے گا کہ یہ کیسے ادیب تھے کہ ان کے پاؤں کے نیچے کی زمین بہیمیت اور بربریت کے سیاہ لاوے کے کھولنے سے تھلک رہی تھی اور ہندوستان کا خونی مجرم غلام اور نامرد سماج انسانیت کو خاک اور خون میں رلانے کی تیاریاں کر رہا تھا اور یہ ذہنی بیداری اور ترقی پسندی کے علمبردار، جذباتی، لہری اور کھلنڈرے بچے نوجوانوں کی مانند اپنی ذمہ داریوں سے گریز کرتے ہوئے محض رومانی تعیش کے طور پر اشتراکیت کے فردوس زریں میں پناہ لے رہے تھے ان کا ادب پرانی دنیا کے کھنڈرات کے ملبہ سے ایک نئی دنیا کی تعمیر نہیں تھا بلکہ ماضی کے اُبسے مردوں کی سڑاندھ سے ایک نہایت امیرانہ گریز تھا یہ ادب تخلیقی فن کی صالح حرکت نہیں تھی بلکہ ایک عصبی بحران اور مراقی ادب تھا "یہ ترقی پسند ادب" ایک کمزور رحم والی عورت سے شدید مشابہت رکھتا تھا اور یہ ترقی پسند عورت" بجائے صحت ور بچوں کے گوشت کے مردہ اور منحنی لوتھڑے جن رہی تھی اس دور کے ترقی پسند ادیب کارل مارکس اور فرائیڈ کے ثقیل نظریات کو ہضم نہ کرنے کے باعث کھٹے ڈکار مار رہے تھے، ورنہ ان کے پیدا کردہ ادب میں ہندوستانی فسادات کے جوالامکھی کی ذرا سی جھلک تو ضرور ہوتی اور وہ ان فرقہ وار اور طبقاتی الاؤں کو اپنے سماج کی انتہائی گہرائیوں سے نکال کر شعوری سطح پر پھینک دیتے کیسا ادب تھا وہ جس میں دو قوموں کے مزاج عقلی کی معمولی سی بھی جھلک

نہیں پائی جاتی۔"

ہم اپنے ترقی پسند ادیبوں کی خدمت میں نہایت مؤدبانہ طریق سے یہ گذارش کریں گے کہ وہ اپنی قوم کے عمرانی اور ثقافتی مزاج کو سمجھنے کے بعد کچھ لکھیں تاکہ ان کی ترقی پسندی مؤثر ہو اور اس میں حقیقی افادیت بھی پیدا ہو جائے۔

رباعیات

معصوم ہیں، وطن سے اپنے چھوٹے ہوئے دل
کسی حسیں کے ٹوٹے ہوئے دل
مظلوم ہیں، رسوا سرِ بازار بدستِ گلچیں
نوچے ہوئے پھول ہیں یہ، ٹوٹے ہوئے دل

آتی ہے بہار، لو پھر آتی ہے بہار
پیغامِ سرور و نور لاتی ہے بہار
نگہیں پھولوں کا منہ پہ لے کر آنچل
کس ناز و ادا سے مسکراتی ہے بہار

دلؔ

مضامین

لکھنے والے:

محمد صدیق کلیم
شبلی بی. کام
شریف کنجاہی

شیکسپیئر کی نظمیں

محمد صدیق کلیم

کولرج نے جو انگریزی ادب میں سب سے بڑا نقاد ہے کسی ذہن رسا کی جانچ کے چند طریقے پیش کئے ہیں۔ بجائے اُس کے شاہکاروں وہ اس کی ابتدائی تحریروں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان سے وہ اس کی آیندہ پرواز اور قابلیت کو پڑھ سکتا ہے اور بتا سکتا ہے کہ کون کتنا مرتبہ حاصل کرلے گا۔ اس مضمون میں وینس اور ایڈونس اور لکریسی کی عصمت دری کا مطالعہ اسی نقطہ نظر سے کیا گیا ہے۔

وینس ایڈونس سے محبت کا اظہار کرتی ہے۔ ایڈونس ابھی کم سن ہے۔ اور محبت کے زخم سے واقف نہیں۔ وینس جوان ہے اور خوبصورت اپنی نفسی تنہائی کو برداشت نہیں کرسکتی۔ وہ ایڈونس کے پاؤں پڑتی ہے۔ شاید ایڈونس کا نفس اُس کے نفس کے لئے ہم آہنگ ثابت ہو۔ ایڈونس اس انداز کو سمجھنے سے قاصر ہے اور اس محبت کا جواب نہیں دیتا۔ یوں بھی وینس کی محبت میں لطفِ حواس بہت زیادہ ہے۔ اور شہوانیت بھی کچھ کم نہیں وہ ایڈونس کو نہایت زور زور سے بھینچتی اور چومتی رہتی ہے۔ اور اس سے

بھی چومنے کا وعدہ لیتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ لطفِ حواس کی زندگی کا فلسفہ بھی پیش کرتی ہے، محبت آگ کا کھیل ہے جس میں شعلوں سے پھاگ کھیلی جاتی ہے، اور دیپک راگ گایا جاتا ہے۔ اور محبوب کی جان سے دُور ہی دُور چلا جاتا ہے۔ چنانچہ "محبت" اور "ہوس" یہ دونوں موضوع شیکسپیئر کے ڈراموں میں بار بار ملتے ہیں۔

محبت اس طرح ہے جیسے دھوپ کے بعد سورج کی دلکش کرنیں۔
ہوس اس طرح ہے جیسے دھوپ کے بعد ہوا کے پُرزور جھکڑ
محبت کا چشمہ ہمیشہ تازہ اور صاف رہتا ہے
ہوس کو بڑھاپا آ جاتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ جوانی گزرنے پائے
ہوس بے راہ روی میں ختم ہو جاتی ہے۔ محبت راہ راست سے
محبت سراسر ایک حقیقت ہے۔ ہوس سراسر مکر و فریب"

نیچر کی تصویر جو بار بار شیکسپیئر کے ہاں ملے گی یہاں یوں کھینچی جاتی ہے

جب وہ دوڑتی ہے تو راہ کی جھاڑیاں
کچھ اس کی گردن کو بوسہ دیتی ہیں اور کچھ پاؤں کو
کچھ اس کی رانوں کو کہ وہ کھڑی رہے
وہ ان کی اس لپیٹ سے جلد ہی رہائی حاصل کر لیتی ہے

اس تمام نظم میں ایک پلاٹ ہے۔ اور ایک کیرکٹر۔ اور یہی دو باتیں خصوصاً

کردار نگاری اس کی بڑی صفات ہیں۔ موت کے فلسفے کی طرف اشارات بھی ہیں۔ ڈر ہے ایڈونس سور کے شکار سے مر نہ جائے۔ اور عورت کی کمزوری کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔

"عورت دودھاری تلوار ہے اور آج تک ایک عورت بھی
دس عورتوں کی عقل رکھتے ہوئے اسکو قابو میں نہ رکھ سکی"

نظم میں جابجا "انتقالِ احساس" سے کام لیا گیا ہے۔ انسانی جذبات کو بلا کم و کاست بے جان فطرت کی طرف منسوب کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تفصیل اور ان کی خصوصیات نہایت خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔

آخر میں محبت کی قسمت تحریر ہوتی ہے۔ وینس جو محبت اور حسن کی دیوی ہے۔ اس کی قسمت میں بے وفائی۔ جدائی اور غم و اندوہ لکھنی ہے۔ ایڈونس کی لاش سے ایک ارغوانی پھول پیدا ہوتا ہے جس میں سرخ و سفید رخسار کے نقش بھی ہیں۔ اس کے بعد وینس آفاق میں گم ہو جاتی ہے۔

لکریسی کی عصمت دری میں ہوس رانی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ بادشاہ طارقوئن ہوس کا شکار ہو کر لیوکریشیا کے حسن کی خوشہ چینی کرتا ہے۔ یہاں طاقت اور ہوس کے جوڑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بادشاہ سے لے کر تاج دینے والا [illegible] ثابت ہونا چاہیے [illegible] اپنے مرتبے کا ناجائز فائدہ اٹھانا [illegible]

تصوّرات - بادشاہ کا مرتبہ - یہ سب باتیں شیکسپیئر کے ڈراموں میں بار بار مبحث بن کے آتی ہیں۔ پھر رات کا نقشہ کھینچا گیا ہے - رات کی خاموشی میں ہر شخص آرام کے لئے چلا جاتا ہے۔ سوائے غم نصیب یا دکھی دلوں کے۔ یا چوروں اور بدکاروں کے رات کے پردے میں بُرائی اور بدی خُوب پھلتی پھولتی ہے۔

پھر ذہنی تضاد جو شیکسپیئر کے کھیلوں کی جان ہے اس نظم میں موجود ہے۔ شہوانی ہوس کے پورا کرنے کا خیال۔ اس کی وجہ سے بیقراری اور بے چینی اس کے ساتھ ساتھ نتائج کی ذمہ داری، اپنی عزّت کا خیال - ایک دوست بھائی کی بیوی کو استعمال کیا جائے یا چھوڑ دیا جائے - یہ سب متضاد باتیں ہیں اور اس کے ذہن کو خوب تنگ کرتی ہیں ضمیر اتنا تاریک اور اندھا کیوں ہوگیا ہے - اسے بورژوا سسٹم کی ایک بُرائی ہی قرار دیا جا سکتا ہے - عزّت اور منطق شاہزادے کے نزدیک بڑے بوڑھوں کا کام ہے آنکھیں جس کی طرف مائل کر دیں - اس سے ذہن کیوں پرے ہٹائے -

اس کے ساتھ ساتھ علامیت سے بھی کام لیا گیا ہے جب سیکسٹس لکریسی کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو دہلیز چیختی ہے - اور چھوٹے چھوٹے پرندے بھی تڑپ اُٹھتے ہیں - خود نیچر اس بدی کی قوت کے خلاف پکار پکار اُٹھتی ہے - پھر انسانی زندگی کی سب سے بڑی [illegible] کو بھی پیش کیا گیا

ہے۔ جبکہ وہ بُرا کام کرتے وقت بھی خدا کو یاد کرتے ہیں اور دل میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ عبادت اور دعائیں اس دھبّے کو دامن سے صاف کر دیں گی۔

عریانی اور فواحش اس تمام نظم میں کافی سے زیادہ ہے۔ جو بعد میں اُس کے ڈراموں میں کم پائی جاتی ہے۔ ایسے ایسے فقرے اور اسالیب بیان ہیں جو تہذیب کے دائرے سے گرے ہوئے ہیں۔ جنسی ملاپ کی مکمل تصویر کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عورت کی بے بسی۔ آہ وزاری اور التجا۔ مرد کا جبر، ظلم اور کمینہ پن۔ سماجی ظلم کے خلاف اشارے ہیں۔ جنسی ملاپ کے بعد کی حالت وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ اس میں ذھنی حالت کا نقشہ اُتارنے کی کوشش کی ہے۔

وہ چوری کرنیوالے کتّے کی طرح بھاگ جاتا ہے
وہ تھکی ہوئی بلی کی طرح وہاں ہانپتی رہتی ہے
وہ اپنے پر طعن کرتا ہے۔ اپنے سے نفرت کرتا ہے
وہ اپنے ناخنوں سے اپنا گوشت نوچتی ہے
وہ رات کی تاریکی کو کوستی رہتی ہے
وہ بھاگتا ہے اور اپنی عزت کے متعلق سوچتا ہے۔

زاں بعد عورت اپنے خاوند اور باپ کو یہ ماجرا کہہ کر خودکشی کر لیتی ہے۔ جنسی تعلق میں خرابی کئی خرابیوں کا باعث بن جایا کرتی ہے۔ زندگی میں انتشار پیدا

کرنا شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ غیور اور با اخلاق عورت اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے۔ روم کی عزت کا امتحان ہے۔ لوگوں میں اخلاقی اور سماجی بصیرت پائی جاتی ہے۔ وہ اس کے تمام خاندان یعنی ٹارکوئن کو جو اس وقت بادشاہت کر رہے تھے ملک بدر کر دیتے ہیں۔ اور جمہوریت کی سی حکومت کی بنیاد رکھتے ہیں۔

اس تجزیے سے ہمیں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ شیکسپیئر آئندہ کن موضوعات پیش کرے گا۔ اس کے انداز میلانات اور رجحانات کیا ہونگے۔ وہ بیرونی واقعات اور خارجی حالات کا خوب مطالعہ کرتا ہے۔ اپنی ذاتی زندگی کے اندرونی مسائل میں ہی الجھا نہیں رہتا بلکہ داخلی جذبات اور خیالات کو بھی بیرونی مشاہدات میں بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس طرح ہمیں اس کی آئندہ عظمت کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

شبلی بی کام

سیاسیات عالم کا ماہانہ جائزہ

فساد اور بدامنی کے مظاہرے عام لوگوں کا خیال تھا کہ دوسری جنگ کے بعد اقوام عالم کے اعصاب کا تناؤ دور ہو جائے گا۔ اور دنیا کو ایک مرتبہ پھر امن وسکون اور آسودگی کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملے گا۔ لیکن جنگ عظیم کے طوفان کا بڑا حصہ ستمبر ۱۹۴۵ء ہی میں تھم گیا۔ اس کے باوجود عالمگیر بےچینی کا ابتک خاتمہ نہیں ہو سکا۔ اور اس وقت دنیا کا شاید ہی کوئی خوش نصیب ملک ایسا باقی ہو گا جہاں ہلچل نہ مچی ہو اور جہاں فساد اور بدامنی کا دور دورہ نظر نہ آئے۔ دراصل جنگ عظیم اقتدار کی کشمکش کا دوسرا نام ہے، اور اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ پست اور غلام قوموں میں بھی بیداری کا احساس پیدا ہو گیا اور انھوں نے سوچا کہ جب دنیا کی بڑی بڑی قومیں ہمیں اپنے فائدے کے لئے ہمیشہ لڑائی کی بھٹی میں جھونکتی رہتی ہیں، اور اسے "آزادی انصاف اور امن" کا نام دیتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم بھی قعر مذلت سے ابھرنے کی کوشش نہ کریں اور استعمار پسند قوتوں کے جال سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پا جائیں چنانچہ انھوں نے بھی ہمت وجرأت سے کام لیا۔ اور جبر واستبداد کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ لیکن کتنے تعجب کی بات ہے کہ وہی قومیں جو ہٹلر کی جرمنی، ٹوجو کے جاپان اور

مسولینی کے اطالیہ کے مسلح توپی کو محض ٹکڑے ٹکڑے پارہ پارہ کر دینا چاہتی تھیں کہ ان کے نزدیک وہ اُن کے حق "آزادی" پہ چھاپہ مارنا چاہتے تھے اب ان کمزور و ناطاقت ملکوں کے خلاف پھر اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں اور اگر وہ "آزادی، انصاف اور امن" کا نام بھی لیتی ہیں تو ان کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے اُن سے تمسخر کیا جاتا ہے اور انہیں کمیونسٹ کہہ کر ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جاتا ہے۔ انھوں نے خود ہی ایک بین الاقوامی عدالت قائم کر رکھی ہے جس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ عدل و انصاف کا پرچم بلند رکھتی ہے لیکن جب ادنیٰ اقوام اپنا معاملہ لیکر اس عدالت کے پاس پہنچتی ہیں تو "کفن دزدانِ چند" کی یہ جماعت اس پر ہمدردانہ غور کرنے کے بجائے اس سوچ میں پڑ جاتی ہے کہ ان غلام قوموں کی قبریں کرہ ارض کے کس گوشہ میں تعمیر کی جائیں اور ان کی تقسیم کس طرح عمل میں آئے؟ چنانچہ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کا حشر ہمارے سامنے ہے فلسطین کا بھیانک انجام ہمیں صاف نظر آرہا ہے، انڈونیشیا، ویٹ نام کوریا اور ملایا کے کفن کی لوٹ کھسوٹ جس طریق پر عمل میں آرہی ہے اس سے بھی اہل بصیرت ناآشنا نہیں ہیں۔ حیدرآباد اور کشمیر کے معاملات میں جو سیاست کار فرما ہے اس سے بھی چشم بینا غافل نہیں رہ سکتی۔

غلامی و استبداد کی جنگ

غرض مشرق سے مغرب تک کسی بھی ملک پر نظر ڈالیے آپ کو ایک ہی کش مکش اور ایک ہی آویزش نظر آئے گی اور وہ ہے غلامی و استبداد کی جنگ! مہذب اور ترقی یافتہ قومیں چاہتی ہیں کہ اس وقت جو ممالک جہالت اور

غلامی کا شکار ہیں وہ اس حلقۂ گرداب میں پھنسی رہیں تاکہ ان کے اقتصادی و معیشی وغیرہ سے اُن کے اقتدار کا چراغ روشن رہے اس کے مقابلہ میں جاہل اور غلام قوموں میں اب یہ احساس پیدا ہو چکا ہے کہ کرۂ ارض پر جس طرح بڑے بڑے سرمایہ دار ملکوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ رانڈ کے سانڈ کی طرح کلیلیں کرتے پھریں۔ اسی طرح وہ بھی اپنے وطن کی فضا میں آزادی کا سانس لینے کی حقدار ہیں۔ لہذا اگر دنیا کی دو قوتوں میں اس وقت ایک ہولناک ٹکر نظر آتی ہے، ایک زبردست تصادم دکھائی دیتا ہے تو یہ محض عمل اور ردِ عمل کا کرشمہ ہے اور اس طوفان کو روکنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں کہ بڑی قومیں اپنے "اخلاقیات" پر نظرِ ثانی کریں، اور حرص و آز کے اس جذبہ کو خارج کریں جو اُن کے سماجی جسم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے۔

آئیے اب ایک ایک ملک کے سیاسی مد و جزر کا الگ الگ جائزہ لیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ گذشتہ مہینے وہ کونسے واقعات و حوادث رونما ہوئے جن کے باعث دنیا کی عام بے چینی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور سیاسیاتِ عالم کی گرہ روز بروز پیچیدہ صورت اختیار کر رہی ہے۔

جنگ چین ہم پاکستان کے باشندے ہیں۔ چین نسبتاً ہمارے قریب ہے اس لئے ہم اپنے جائزے کا آغاز اسی ملک سے کرتے ہیں۔ اس وقت ممالک اسلامیہ اور یورپ میں بعض ایسے انقلاب انگیز واقعات ہو رہے ہیں کہ اخبار بین طبقہ کی نگاہیں بالعموم مغرب ہی کی طرف لگی رہتی ہیں۔ اور ان کو مشرق میں اپنے ہمسایہ پر نظر ڈالنے

کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ حالانکہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کے سامنے یورپ کے اکثر واقعی کی دلچسپی ہیچ ہے۔ چین میں ایک ہولناک خانہ جنگی برپا ہے اور آج سے نہیں بلکہ قریباً دس برس سے لیکن اس کے انسداد کی ابھی تک کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ آج سے سترہ اٹھارہ برس بیشتر چین کی لڑائی جاپان سے تھی۔ کیونکہ اس زمانہ میں جاپان "بھی" دور سے نیا نیا نکل کر "استعمار پسندی" کے میدان میں آیا تھا اور ہمسایہ ممالک کو ہڑپ کرتا ہوا سارے ایشیا میں اپنے پنجے گاڑ دینا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے چین کے ساحلوں کو حریصانہ نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا جس کو چین کے قوم پرست برداشت نہ کر سکے اور وہ کئی برس تک جاپانی فاشزم سے برسرِ پیکار رہے۔ اتنے میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ اور جاپان کو بعض اور مصروفیات میں "الجھنا پڑا" لیکن اس دوران میں چین کے گھر میں "چراغ خانہ" ہی سے آگ لگ گئی جس کے شعلے ایک تہائی سے زیادہ دھرتی کو چاٹ چکے ہیں، اس کے باوجود وہ بجھنے میں نہیں آتے۔ در اصل چین میں کہنے کو تو ۱۲ سال سے ہی میں جمہوری نظام قائم ہو چکا تھا لیکن اس کے پردے میں جو "دیو استبداد" پاؤں کوب رہا ہے اسکا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ چین میں ابھی تک سرمایہ دارانہ نظام پایا جاتا ہے اور چیانگ کائی شیک کی "کومن تانگ" کسانوں پر بے پناہ ظلم ڈھا رہی ہے۔ چنانچہ سنہ ۲۶ء میں جب حکام چین نے فوج کے لئے غلّہ کی بڑی بڑی مقداریں مخصوص کر لیں تو کسانوں نے "سرکار پرست چین" کے خلاف مسلح بغاوت کر دی۔ کاشتکاروں نے ٹیکس دینے سے انکار کر دیا۔ اور جب کومن تانگ نے تعزیری کارروائی کی تو

جگہ جگہ انقلاب بغاوت کے نعرے گونج اٹھے اور یہ شورش جنگل کی آگ کی طرح اس طرح پھیلی کہ اب تک اس کے شعلوں سے چھٹکارا نہیں مل سکا۔ چیانگ کائی شیک کو شکایت ہے کہ امریکہ نے اسے اسلحہ اور ڈالر نہیں دیئے۔ حالانکہ اب تک جتنی لڑائی ہو چکی ہے وہ بھی امریکی ڈالروں اور امریکی ہتھیاروں کے طفیل جاری رہی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کسانوں کی بغاوت نے "من تانگ" کا بھرکس نکال دیا۔ اور وہ نہ صرف جنوبی چین کے ایک معتدبہ حصے پر قابض ہو چکے ہیں بلکہ انھوں نے شمالی چین میں بھی اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ کامیابی ہر جگہ "باغیوں" کے قدم چوم رہی ہے اور وہ ہر محاذ پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ چین امریکہ اور برطانیہ کے فاشسٹ ان کو کمیونسٹ کہہ کر پکار رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ روس نے عملی طور پر ان کی کوئی امداد نہیں کی اور ان کی سپاہ میں اسّی فیصدی مسلمان ہیں جو کومن تانگ سے اس لئے نبرد آزما نہیں ہیں کہ وہ نانکن کے "ایوان اقتدار" پر درانتی اور ہتھوڑے کا سرخ جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں، بلکہ ان کا مقصد محض یہ ہے کہ چین میں "عوامی حکومت" قائم کی جائے۔ ابھی پہلے ہفتے اطلاع آئی تھی کہ پچاس ہزار "کمیونسٹوں" نے دریائے یانگسی کے پار حملہ کر دیا ہے۔ چین کی قوم پرست فوجیں ان کا آگا روکنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن ان کو ناکامی کا سامنا ہو رہا ہے۔ دراصل اس وقت چین کے اقتصادی حالات بہت زیادہ نازک ہو چکے ہیں۔ مالی تار و پود بکھر چکا ہے، معاشی نظام درہم برہم ہو چکا ہے اور مستقبل قریب میں ان حالات کے سدھرنے کی کوئی امید بھی نہیں ہے۔ چین کے ڈالر کی قیمت ہولناک

سطح تک گر چکی ہے۔ اس مہینے اطلاع آئی ہے کہ ایک امریکی ڈالر خریدنے کے لئے پچاس لاکھ چینی ڈالروں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک اور اطلاع یہ ہے کہ ایک روپیہ میں ۱۵ لاکھ چینی ڈالر خریدے جا سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں چین "ٹوٹ ٹیڈ زدہ" کا شکار ہے اور اشیا کی قیمتوں میں ناقابل یقین حد تک اضافہ ہو چکا ہے ظاہر ہے کہ ان حالات میں چین کا مالی، سیاسی اور فوجی نظام اپنی بنیادوں پہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اور اسے جلد یا بدیر "باغیوں" کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔ چنانچہ "کومن تانگ" کے بہترین دوست بھی چین کے مستقبل سے مایوس ہو چکے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ کو بھی چیانگ کائی شیک کی کامیابی پہ اعتماد نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مرتبہ امریکہ نے اپنی امداد روک لی ہے اور چین کے مصائب میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔ چین کے نئے وزیر اعظم کا یہ قول اب خواب بن چکا ہے کہ "دو سال کے اندر اندر چینی کمیونسٹوں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا"

کوریا میں جمہوریت کا قیام موجودہ جنگ سے پہلے کوریا میں جاپان کی ایک کٹھ پتلی حکومت قائم تھی۔ لیکن جنگ کے بعد اس میں اشتمالیت پسندوں کا زور ہو گیا۔ چنانچہ شمالی کوریا میں تو کمیونسٹ برسر اقتدار ہیں۔ اور جنوبی کوریا جمہوریت پسندوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس مہینے جنوبی کوریا میں قومی اسمبلی قائم کر دی گئی اور نیا آئین نافذ کرنے کے لئے دستور ساز ایوان کے انتخابات عنقریب شروع ہونے والے ہیں۔ گزشتہ مہینے کی آخری تاریخ کو جنوبی کوریا کی پہلی مجلس ملی کا ایک اجلاس ہوا جس میں ڈاکٹر

"سنگمن ری" نے "جمہوریہ کوریا" کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر بعض لوگوں نے "روس شمالی کوریا سے نکل جائے" کے نعرے بھی لگائے۔ ڈاکٹر سنگمن نے اعلان کیا کہ وہ کمیونسٹوں کو آخری موقعہ دینے کے لئے تیار ہیں کہ وہ جنوبی کوریا سے تعاون کریں لیکن اگر وہ کوریا کو کسی بیرونی ملک سے وابستہ کرنے پر مصر رہے تو ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ اس جلسہ میں کوریا کے امریکن، کمانڈر جنرل جان ہاج نے جمہوریہ کوریہ کو ہر ممکن امداد پہنچانے کا وعدہ کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوریا میں بھی امریکی و روسی مفاد کی کشمکش جاری ہے۔ جنگ کے زمانہ میں اس ملک کے جنوبی علاقوں پر امریکیوں کو قابض ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ دوسری طرف شمالی کوریا میں روسیوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر طرفین کے مفاد کی ٹکر یہاں بھی نظر آتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں سے فتح کس کی ہوتی ہے؟

انڈونیشیا اور ڈچ کے مذاکرے

انڈونیشیا بھی جنوب مشرقی ایشیا کے ان ممالک میں سے ہے جن کو مغربی اتحادی جنگ کے زمانہ میں کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اور اب کہ وہ فتح کے نشہ میں سرشار ہیں دوبارہ ان پر قابض ہونے کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔ حالانکہ اب ان ممالک میں جذبۂ آزادی بیدار ہو چکا ہے اور ان کو دنیا کی کوئی مسلح طاقت پنجۂ استبداد میں گرفتار نہیں کر سکتی۔

انڈونیشیا جنگ سے پہلے ہالینڈ کی ایک نوآبادی تھی جنگ کے دوران ہی میں ..... ان لوگوں نے آزادی کامل کا مطالبہ کیا۔لیکن ڈچ حکومت کو نوآبادی کی بجائے اپنے وطن کی فکر تھی اس لئے وہ اس ملک کو جاپانی استعمار کے حوالے کر کے خود بھاگ گئی، جنگ کے بعد انڈونیشیا پر دوبارہ قبضہ کا سوال آیا۔تو ڈچ حکومت کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ انڈونیشیا کو اب غلامی کے جوئے میں گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔چنانچہ اس نے استعمار پسندانہ سنت کے مطابق انڈونیشیا سے کہا کہ وہ اپنے مطالبات پیش کرے جب انڈونیشیا نے "آزادی، امن اور انصاف" کا نعرہ لگایا تو ڈچ حکومت کو جیسے سانپ سونگھ گیا اس نے پہلے تو لیت ولعل سے کام لینا چاہا اور ایک عارضی عوامی حکومت بھی قائم کردی لیکن جب انڈونیشیا کے باشندوں کا نعرہ انقلاب انگیز حیثیت اختیار کر گیا اور وہ اپنے حقوق کے حصول کے لئے جنگ پر تل گئے تو ڈچ حکومت نے عارضی صلح کرلی۔جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس وقفہ سے فائدہ اٹھا کر فوجی طاقت میں اضافہ کرلیا جائے، جب انڈونیشیا نے دیکھا کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا تو اس نے اپنا معاملہ سکیورٹی کونسل میں پیش کردیا، لیکن سکیورٹی کونسل بھی بقول اقبال "کفن چوروں" کی جماعت ہے، اس نے کمیشنوں، اور قراردادوں کا ایک ایسا چکر چلایا کہ انڈونیشیا کے لئے اب تک اس میں سے نکلنا دشوار نظر آرہا ہے، انڈونیشیا اور ڈچ حکومت میں گفت وشنید جاری ہے، لیکن اس دوران میں "رینوائل معاہدے" کے علی الرغم ڈچ نے انڈونیشیا میں فوجی کارروائی

جاری رکھی اور جمہوری حکومت کے ہاتھ سے کافی علاقے چھین لئے - اور اپنے اقتدار سے فائدہ اٹھا کر مغربی جاوا اور مدورا کی ان سیاسی جماعتوں کو جمہوریہ کے خلاف شہ دی، جو پہلے ہی جمہوریت کی مخالف بتائی جاتی ہیں۔ انڈونیشیا کی تمام سیاسی جماعتوں نے آپس میں مل کر فیصلہ کیا تھا کہ وہ استعمار پسند لیڈروں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں لیکن ابھی تک اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا سیکیورٹی کونسل نے معاہدے کی شرائط پر عمل کرانے کے لئے ایک "مجلس خیر سگالی" بھی انڈونیشیا میں بھیجی تھی۔ لیکن اس کا طرز عمل چونکہ غیر جانبدارانہ نہیں رہا۔ اس لئے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔

اس مہینے اطلاع آئی ہے کہ انڈونیشیا اور ہالینڈ کے مذاکرے ختم کر دیئے گئے - ڈچ حکومت نے عذر یہ پیش کیا ہے کہ ایک مجوزہ عہد نامے کی کچھ شرطیں وقت سے پہلے اخبارات میں شائع ہو گئیں اور اس میں قصور امریکی نمائندے کا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ بہانہ محض گفتگو ختم کرنے کے لئے تراشا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہالینڈ دیکھ رہا ہے اگر اس نے مذاکرے جاری رکھے تو اسے جنوب مشرقی ایشیا کی اس سونے کا انڈا دینے والی مرغی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اس لئے وہ افہام و تفہیم کی بجائے فوجی قوت پر انحصار رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں روس نے ڈچ حکومت پر یہ الزام بالکل درست لگایا تھا کہ وہ صلح سے فائدہ اٹھا کر فوجی قوت میں اضافہ کر رہی ہے، روس کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہالینڈ

۷ کروڑ باشندوں کے جذبۂ آزادی کو محض اس لئے کچلنا چاہتا ہے کہ اس کا آقائے ولی نعمت امریکہ اس سے خوش رہے جس کے مفاد کا دامن انڈونیشیا سے بھی وابستہ ہے، انڈونیشیا اچھی طرح جانتا ہے کہ اب لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے چنانچہ مشرقی انڈونیشیا کے وزیر اعظم نے اعلان کیا ہے کہ اگر اس ملک کو یکم جنوری ۱۹۴۹ء تک آزاد نہ کیا گیا تو نتائج بہت خطرناک ہوں گے۔

ملایا میں برطانیہ کا تشدد | جنگ کے بعد ملایا نے بھی برطانوی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی تھی لیکن انگریزی فوجیں اس کے جذبۂ آزادی کو بری طرح کچل رہی ہیں۔ اور الزام یہ لگایا گیا ہے کہ بغاوت ملایا کے لوگوں نے نہیں کی بلکہ اس کے ذمہ دار "چینی کمیونسٹ" ہیں۔ جو انگریزوں سے جنگ چپاول کر رہے ہیں۔ اور ان کا مقصد یہ ہی کہ مشرق میں برطانیہ کو بعض ایسی مصروفیات میں الجھا دیا جائے کہ مغربی یورپ میں روس کو فائدہ اٹھانے کا موقع مل جائے، چنانچہ برطانوی فوجوں نے ملایا کے "باغیوں" کی سرکوبی کے لئے توپوں کے دہانے کھول دیئے ہیں اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کیا جا رہا ہے، لیکن ملایا کے "باغی" بھی نہتے نہیں ہیں، انھوں نے "دہشت پسندی کی تحریک" شروع کر دی ہے۔ چنانچہ ان کو جب بھی موقع ملتا ہے وہ ربڑ کے بڑے بڑے کاشتکاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں اور روزانہ ایک دو برطانوی سپاہیوں کو کیفر کردار تک پہنچاتے ہیں۔ برطانیہ اس سے بہت زیادہ برافروختہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف وہ اپنے پروپیگنڈے

کی مشین کو پوری طرح ملایا کے باغیوں کے خلاف استعمال کر رہا ہے اور دوسری طرف "لندن ٹائمز" کے مشورہ کے مطابق ان کو کچلنے کے لئے جدید ترین اسلحہ استعمال کرنے پر بھی اتر آیا ہے۔ اس دو طرفہ محاذ کا جو نتیجہ نکلے گا وہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ملایا کے باغی لاکھ بہادر ہوں لیکن وہ برطانیہ کی شہنشاہی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بہرحال مقابلہ کافی سخت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ملایا کے پڑوسی کس حد تک اس کی اخلاقی یا فوجی امداد پر کمربستہ ہوتے ہیں؟

ہند چینی اور فرانس براعظم ایشیا کے جنوب مشرقی کونے میں "ہند چینی" کے نام سے ایک چھوٹا سا ملک ہے جس پر جنگ سے پہلے فرانسیسیوں کا اقتدار قائم تھا۔ جنگ کے بعد دوسرے ایشیائی ممالک کی طرح اس علاقہ نے بھی آزادی کی کروٹ لینی چاہی لیکن معلوم ہوتا ہے فرانس نے گزشتہ جنگ کے تجربے سے کچھ بھی نہیں سیکھا چنانچہ وہ مدت سے کوشاں تھا کہ ہند چینی میں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم ہو جائے جو فرانسیسیوں کو "جواب صاف" دینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کچھ عرصہ ہوئے ہند چینی کے مسلمہ قومی لیڈر "ہوچی من" نے چاہا کہ فرانسیسی کمشنر موسیو بلاں سے اس بارے میں گفت و شنید کریں۔ لیکن فرانسیسی کمشنر کی رعونت اسے گوارا نہ کر سکی۔ کیونکہ اسے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اتنا بڑا جمہوریت پسند ہو کہ فرانس کی غلامی قبول کر لے۔ ایک صاحب نے جنہیں حکومت بنانے کے لئے کہا گیا خودکشی کر لی، دوسرے صاحب نے اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ انہوں نے

ایسی حرکت کیوں کی کہ فرانسیسیوں کے کہنے میں آ گئے۔ اب تنکے کا سہارا لینے کی خاطر جنرل ژاں کے نام قرعہ فال نکلا ہے۔ انھوں نے ایک کابینہ بھی بنا لیا ہے لیکن انہیں نمایندہ قسم کے لوگ میسّر نہیں آ سکے۔ انھوں نے وزارت کے لئے بعض ایسے آدمیوں کو منتخب کیا ہے جن سے عوام کو نفرت ہے، پیرس کے سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ فرانس کی لڑائی ہندچینی کی قومیت سے نہیں بلکہ اس "سُرخ فسطائیت" سے ہے جو ہندچینی میں قدم جما رہی ہے۔ اور ایک ڈپلومیٹ کا کہنا ہے کہ اگر فرانس اس علاقہ سے دست کش ہو جائے تو امریکہ ورنہ چین اس پر قابض ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں محض ہندچینی کے مطالبوں کو ٹالنے کے لئے کہی جا رہی ہیں۔ ورنہ اگر خود فرانس آزاد ہو گیا ہے تو اسے برطانیہ اور روس کی طرف سے خطرہ کیوں نہیں ہے؟

ہندوستان اور پاکستان کی آویزش | اب ہم جنوبی ایشیاء کی طرف آتے ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے متفقہ فیصلہ کے مطابق ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔ ایک کا نام "پاکستان" قرار پایا اور دوسرا "ہند یونین" کہلاتا ہے۔ عام حالات میں "انتقال اختیارات" نہایت پُرامن طریقے سے انجام پا جانا چاہیئے تھا، لیکن انگریزی کی سیاست اگر اس موقع پر کوئی مہلک کروٹ نہ بدلتی تو برطانوی روایات کا تقاضا کیوں کر پورا ہوتا۔ چنانچہ انگریزی جاتے جاتے جاتے بھی ایک ایسی چنگاری ڈالی کہ اس کا خمیازہ ہندوستان اور پاکستان کو آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے

یہ دونوں ملک ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ اس کے باوجود اُن کے مطمح نظر اور نصب العین میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں میں ابھی تک اشتراکِ عمل کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی اور وہ کسی نہ کسی مسئلہ پہ ایک دوسرے سے اُلجھتے رہتے ہیں، اس وقت حیدرآباد اور کشمیر دونوں مملکتوں کے مابین مابہ النزاع مسائل بنے ہوئے ہیں، لارڈ مونٹ بیٹن کے اعلانِ جون کے مطابق ہندوستان کی ریاستوں کو اس بات کی اجازت حاصل تھی کہ وہ دونوں مُلکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اشتراکِ عمل کریں۔ لیکن اگر ان کو الحاق منظور نہ ہو تو وہ آزاد و خود مختار رہ سکتی ہیں۔ اکثر ریاستوں نے تو برضا و رغبت اپنے بعض اختیارات پاکستان یا ہندوستان کے حوالے کر دیئے۔ لیکن حیدرآباد اور کشمیر دونوں تر نوالے ثابت نہ ہوئے۔ انڈین یونین کی حرص و آز نے ان ریاستوں کے مسئلہ کو "استخوانِ نزاع" بنا کر چھوڑا۔ اور فریقین اب تک ان کے حصُول کے لئے غرا رہے ہیں۔ کشمیر حیدرآباد کا ذکر تو آگے آئیگا۔ لیکن یہاں ہندوستان و پاکستان کی آویزش کے سلسلہ میں ایک دو اور باتوں کا ذکر کر دینا مناسب ہے، ان دونوں ملکوں کے درمیان جو کھچاؤ پایا جاتا ہے اس میں "پرمٹ سسٹم" اور "املاک" خاص طور پر اضافہ کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں گاندھی جی کی قربانی کے بعد فضا قدرے اطمینان بخش ہو چلی تھی۔ مہاجر مسلمانوں نے اس سے فائدہ اُٹھا کر اپنے اپنے وطن کو لوٹ جانا چاہا۔ اسی طرح ہندو بھی کافی تعداد میں پاکستان واپس آکر آباد ہونے پر تیار ہو

ہو گئے تھے۔ لیکن انڈین یونین نے اس مہینے "پرمٹ سسٹم" جاری کر کے ہندو مسلم عناد کے شعلوں کو دوبارہ ہوا دیدی ہے۔ اب اگر پاکستان بھی انتقامی رنگ میں "اجازت نامے" کا سلسلہ جاری کر دے تو عجب نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان اقدامات سے حالات روبہ اصلاح نہیں ہو سکتے، بلکہ فضا کو اور زیادہ زہر آلود بنانے کا باعث بن سکتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان جو جائداد مشرقی پنجاب یا دہلی میں چھوڑ کر آئے ہیں اس کا مبادلہ بھی ابھی تک نہیں ہو سکا۔ یہی حالت غیر مسلموں کی جائداد کی ہے۔ ان حالات میں اگر ہندوستان و پاکستان کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کی امید کی جائے تو یہ خوش فہمی نہیں تو کیا ہے؟

حیدرآباد کا مسئلہ | پچھلے مہینے انڈین یونین نے نظام حیدرآباد سے جو گفتگو شروع کی تھی وہ اس مہینے آکر ٹوٹ گئی۔ ہندوستان نے حیدرآباد سے ایک معاہدہ جاریہ کیا تھا جس کے ماتحت حکومت آصفیہ کو اپنے امور خارجہ، دفاع اور مواصلات نئی دہلی کی نگرانی میں رکھنے پڑے۔ لیکن ہند یونین نے اس پر اکتفا نہ کی بلکہ حضور نظام سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی مملکت میں جلدی سے جلدی نمایندہ حکومت قائم کریں۔ یہاں تک تو خیر تھی، لیکن انڈین یونین کی نیت چونکہ نیک نہ تھی اس لئے ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے یہ بھی جاری کیا کہ حیدرآباد کے نئے کابینہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا برابر کا حصہ دیا جائے۔ اس کے علاوہ حضور نظام سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ وہ نئی دہلی کی اجازت کے بغیر اپنی فوج میں اضافہ نہ کریں، تمام فوجی قوانین

حکومت ہند کی اجازت سے نافذ کریں اور رضاکار فوجیں توڑ دی جائیں۔ حضور نظام نے اپنے آئینی مشیر سر والٹر مانکٹن اور اپنے وزیر اعظم میر لائق علی کے توسط سے حکومت ہند پر واضح کیا کہ وہ ریاست میں نمایندہ حکومت قائم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے آئین ساز اسمبلی کے قیام کا فیصلہ کر لیا گیا، لیکن وہ کابینہ اور دستور یہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساویانہ درجے دینے کو تیار نہ تھے۔ کیونکہ اول تو یہ اقدام حیدر آباد کی ثقافتی روایات کے منافی ہوتا۔ دوسرے نظام کی رعایا شاید اس "انقلاب" کو برداشت بھی نہ کر سکتی۔ چنانچہ ہند یونین اور حیدر آباد کی بات چیت اسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی جس کے بعد نہرو اور پٹیل گورنمنٹ نے دھمکی دی کہ اگر حیدر آباد ہندوستان میں شامل نہ ہوا تو وہ اس پر چڑھائی کر دیگا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے نئی دہلی سے لشکر روانہ بھی ہونے لگے، اس کے ساتھ ہی معاشی ناکہ بندی کر کے اس کا گلا گھونٹنے کی سعی کی گئی۔ لیکن حیدر آباد ان تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کر رہا ہے۔ اور ہندوستان کی گیدڑ بھبکیوں کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس مہینے میں ہندوستان نے حیدر آباد کا کروڑ ہا روپیہ ضبط کر لیا، کرنسی کا مبادلہ منسوخ کر دیا، ڈاک اور تار پر پابندی عائد کر دی، حیدر آباد کے طیاروں کو ہندوستان کی فضاؤں میں پرواز کرنے سے منع کر دیا۔ اس کے باوجود اس سے یقین ہے کہ "معاہدہ جاریہ" کی خلاف ورزی نہیں ہوئی، حیدر آباد کی سرحدوں پر انڈین یونین کے غنڈے روزانہ حملے کرتے ہیں، اور چند دن ہوئے

انھوں نے مملکت آصفیہ کے ایک گاؤں ننناج پر قبضہ بھی کر لیا ہے لیکن انڈین یونین ابھی تک دنیا کی نگاہوں میں سچی ثابت ہونے کے لئے برابر کہہ رہی ہے کہ زیادتی حیدرآباد کے رضاکاروں کی ہے، وہ ہندوستانی سرحدوں پہ چھاپے مارتے ہیں اور مولانا سید قاسم رضوی ان کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ لیکن کوئی پوچھے تم نے سٹڈ ٹی کاٹن کے معاملہ کو خواہ مخواہ طول کیوں دیا؟ تمہاری فوجیں روزانہ حیدرآباد پہ حملہ آور کیوں ہوتی ہیں؟ تم نے ناکہ بندی کیوں کر رکھی ہے؟ تم حیدرآباد کو ہندوستان میں شامل ہونے پہ کیوں مجبور کرتے ہو؟ اگر جغرافی وضعیت یا کثرت آبادی کا سوال ہے تو کشمیر کے معاملہ میں تمہارا دل کیوں بیٹھے لگتا ہے؟ کیا یہ تباین اور تضاد نہیں؟ کیا یہ جبر و استبداد نہیں؟ کیا یہ معاہدۂ جاریہ کی خلاف ورزی نہیں؟ بہر حال حیدرآباد نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنا معاملہ سکیورٹی کونسل میں پیش کریگا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے کاغذات تیار ہو چکے ہیں اور وفد بھی عنقریب پیرس روانہ ہونے والا ہے تاکہ ماہ ستمبر میں یہ مقدمہ جنرل اسمبلی کے روبرو رکھا جا سکے۔ اگر حیدرآباد نے یہ قدم اٹھایا تو ظاہر ہے تمام اسلامی ممالک کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوں گی اور انڈین یونین کے لئے اپنے دامن کو غیر داغدار ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا۔

کشمیر پہ ہند کی نظریں کشمیر کے بارے میں ہندو یونین نے جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہے وہ اس رویے کے بالکل برعکس ہے جو حیدرآباد میں نظر آتا ہے۔

کشمیر کی معاشی اور جغرافیائی وضعیت کا تقاضا ہے کہ وہ پاکستان میں شامل ہو اس کے علاوہ وہاں کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن انڈین یونین محض انگریز کی شہ پر کشمیر کے معاملات میں دخل انداز ہو رہا ہے اور اسے ایک ایسے شخص کی امداد کرنی پڑ رہی ہے جس کو عام حالات میں شاید اس کے عقیدت مند برداشت نہ کر سکیں۔ انڈین یونین نے پہلے خود ہی یہ تجویز پیش کی تھی کہ کشمیر کا معاملہ سکیورٹی کونسل کے روبرو رکھا جائے لیکن جب اتحادی انجمن میں اس کے نمایندے کی کوئی دال نہ گل سکی تو اب وہ سکیورٹی کونسل کے فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے سے گریز کر رہا ہے سکیورٹی کونسل نے گذشتہ اپریل میں یہ قرارداد منظور کی تھی کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ خود وہاں کے رہنے والے ہی کریں۔ لیکن اس سے پہلے تین باتیں ضروری ہیں (۱) لڑائی بند کر دی جائے (۲) قبائلی اپنی فوجیں واپس بلا لیں اس کے بعد ہندوستان بھی اپنی فوجیں آہستہ آہستہ نکال لے (۳) کشمیر میں عبوری حکومت قائم کی جائے۔

لیکن کشمیر پر بحث کے دوران میں پاکستان کے نمایندے کا نقطۂ نظر یہ رہا کہ وہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان کشمیر کے مسئلہ ہی کو مابہ النزاع نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ اس کے نزدیک مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام اور جوناگڑھ کا استصواب رائے عامہ ایسے واقعات تھے جن کی تحقیق بھی ضروری تھی کیونکہ اس کے بغیر دونوں مملکتوں کے تعلقات خوشگوار نہیں ہو سکتے تھے۔ اتحادی انجمن

کے ارکان کو پاکستان کے نمایندے کے استدلال میں معقولیت کی جھلک نظر آئی
اس لئے اس نے ایک بین الاقوامی کمیشن بھیجنے کا فیصلہ کیا جو نہ صرف کشمیر میں آزادانہ
استصواب کرائے گا بلکہ "دوسرے امور" کی چھان بین بھی کرے۔ پاکستان کو سکیورٹی
کونسل کے فیصلہ پر بہت سے اعتراضات تھے اس کے باوجود اس نے کشمیر کمیشن
سے تعاون کرنے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن پنڈت نہرو اس بنا پر حیل وحجت کرتے رہے۔
کہ پہلے کشمیر کمیشن کی آمد کا مقصد بتایا جائے۔ حالانکہ بات بالکل واضح تھی اور پنڈت
نہرو محض تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے تھے۔ بہرحال انڈین یونین کی لے دے
کے باوجود کشمیر کمیشن اس مہینے آ پہنچا اور اس نے کشمیر میں اپنا کام شروع بھی کر دیا ہے
معلوم ہوا ہے کہ وہ طرفین کو لڑائی بند کرنے کی ہدایت دے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ
جب تک کشمیر میں عبداللہ کی حکومت قائم ہے اور ہندوستانی فوجیں موجود ہیں آزاد
کشمیر گورنمنٹ اس پر عمل کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو گی۔ باقی رہا پاکستان کا رویّہ
تو وہ پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے کہ پاکستان کو کشمیر کی جنگ سے براہ راست
کوئی دلچسپی نہیں ہے، اس کے نزدیک کشمیر میں عوام ہی قبائلیوں کی امداد سے
ڈوگرہ شاہی کے خلاف برسرپیکار ہیں اس لئے وہ جنگ بند کرانے میں
اپنا اثر و رسوخ استعمال نہیں کر سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کشمیر کمیشن آزادانہ
استصواب رائے سے پہلے ہندوستانی فوجوں کو کشمیر سے نکالنے اور "دوسرے
امور کی تحقیق" کرنے پر تیار ہو گا؟ اگر نہیں تو جس مقصد کو لیکر یہ کمیشن یہاں آیا

ہے وہ پورا نہیں ہو سکتا۔

عربوں اور یہود کی منازعت | اس وقت تمام دنیا کی نگاہیں فلسطین پر لگی ہوئی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کے سرمایہ دار اور یہود نواز ممالک ہمیشہ اسی کوشش میں رہے ہیں کہ ارض مقدس کو یہود کا وطن قرار دیا جائے تاکہ ایک طرف خدا کی اس راندھی ہوئی مخلوق کو گوشۂ عافیت میسر آسکے۔ اور دوسری طرف وہ اس کے توسط سے مشرق وسطیٰ کے روغنی وسائل سے مستفید ہو سکیں۔ لیکن یہود کے اقتدار میں عربوں کی موت ہے، اس لئے وہ فلسطین میں اس سود خور قوم کو آباد ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ موجودہ جنگ کے بعد اتحادیوں نے یہود کی خدمات کا صلہ اس رنگ میں دینا چاہا کہ ان کے لئے فلسطین میں ایک علیحدہ مملکت قائم کر دی جائے۔ چنانچہ جب عربوں نے اپنا حق آزادی مانگا تو اتحادیوں نے یہود کی زبان سے بھی اپنا مطالبہ پیش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں اور یہودیوں کے درمیان اعصابی جنگ شروع ہو گئی اور وہ ایک دوسرے پر پل پڑنے کے لئے پر تولنے لگے۔ ادھر جنگ نے برطانیہ کا دیوالہ نکال رکھا تھا اس لئے وہ یکے بعد دیگرے اپنے مقبوضات سے دستبردار ہونے لگا فلسطین کے بارے میں بھی اس نے فیصلہ کیا کہ اپنا انتداب جلد سے جلد اٹھا لے۔ چنانچہ جونہی اس کی فوجیں حیفہ کی بندرگاہ سے رو[illegible]ئیں عربوں اور یہودیوں میں باقاعدہ جنگ شروع

ہوگئی۔ شروع میں عربوں کا پلہ بھاری تھا۔ اس لئے اتحادیوں کو قدرتی طور پر تشویش لاحق ہوئی۔ چنانچہ فلسطین کا مسئلہ سکیورٹی کونسل کے سپرد کر دیا گیا سکیورٹی کونسل میں ابھی امریکہ کی اس تجویز پر بحث ہی ہو رہی تھی کہ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کی دو الگ الگ ریاستیں قائم کر دی جائیں کہ یہود نے "اسرائیلی" حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ سکیورٹی کونسل نے چاہا کہ طرفین میں عارضی صلح کرا دی جائے تاکہ فلسطین کے مسئلہ کا کوئی مستقل حل تجویز ہو سکے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے کاونٹ برنا ڈوٹ کو اتحادی انجمن کا ثالث مقرر کیا گیا لیکن وہ بھی فریقین میں سمجھوتہ کرانے سے قاصر رہا۔ تاہم "متارکہ" کا اعلان کر دیا گیا۔ عرب جانتے تھے کہ اس کی غرض محض یہ ہے کہ یہودی پناہ گزینوں کو فلسطین میں داخل ہونے کا موقعہ دیا جائے۔ اور بیرونی امداد بھی بروقت یہود کو پہنچ سکے۔ تاہم عرب لیگ نے اس تجویز کو مان لیا۔ لیکن یہود نے "متارکہ" کی شرائط کی کئی دفعہ خلاف ورزی کی۔ چنانچہ جنگ برابر جاری رہی۔ اس کے بعد سہ روزہ متارکہ کا اعلان کیا گیا۔ لیکن یہود نے اس کی بھی پروانہ کی۔ اور جنگ برابر جاری ہے۔ اس وقت کاونٹ برنا ڈوٹ اور سکیورٹی کونسل کے سامنے قضیۂ فلسطین کا مستقل حل ہے لیکن جب تک عربوں کے مطالبات پر غور نہ کیا جائے گا اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ عربوں کے مطالبات مختصر الفاظ میں یہ ہیں کہ ارض مقدس میں یہود کی علیحدہ سلطنت قائم نہ کی جائے۔ نام نہاد "اسرائیل" کو اتحادی انجمن

تسلیم نہ کرے اور عرب پناہ گزینوں کی آبادکاری کے لئے کوئی موثر قدم اُٹھایا جائے۔ کاونٹ برنا ڈوٹ کی رپورٹ پر غور و خوض ہو رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سکیورٹی کونسل عربوں کے ان مطالبات پر کس حد تک غور کرتی ہے لیکن جہاں تک سرمایہ دار ممالک کی نفسیات کا تعلق ہے اُس کے پیش نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ اتحادی انجمن سے انصاف کی توقع رکھنا بیسود ہے فلسطین کی گتھی عربوں کی تلوار ہی سلجھا سکتی ہے۔ اور یہ تلوار اب یہود کے سر پر باقاعدہ چمک رہی ہے!

برلین کی کشیدگی | جرمنی کا شکست خوردہ دارالسلطنت اس وقت یورپ کا آشوب چشم بنا ہوا ہے۔ اس شہر پر چاروں اتحادی قابض ہیں اور ان کے علیحدہ علیحدہ منطقے قائم کر دیئے گئے ہیں لیکن جب ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں تو ایک شہر میں چار الگ الگ نظام کیونکر برداشت کئے جا سکتے ہیں، گذشتہ مہینے رُوس نے محسوس کیا کہ چاروں علاقوں میں الگ الگ کرنسی رائج ہے جس کے روس زر پر خاص طور پر بُرا اثر پڑ رہا ہے اور مغربی اتحادی اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے نہ صرف مغربی اتحادیوں کی کرنسی کا داخلہ اپنے علاقہ میں بند کر دیا۔ بلکہ آمد و رفت کے ذرائع بھی مسدود کر دیئے اور یہ پیش کیا کہ ریل گاڑیوں اور کشتیوں کی مرمّت ہونے والی ہے۔ آمد و رفت پر پابندی عائد کرنے کے دوسرے معنی یہ تھے کہ معاشی طور پر برلین کا گلا گھونٹ دیا جائے چنانچہ مغربی اتحادیوں کو بہت جلد اس بات کا احساس ہو گیا کہ اگر یہ پابندی ایک

مہینے تک اور جاری رہی تو بیس لاکھ جرمن بھوکوں مر جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی ان کو خود بھی بہت زیادہ نقصان ہوگا۔ چنانچہ فرانس، امریکہ اور برطانیہ نے مل کر روس کو ایک احتجاجی یادداشت روانہ کی لیکن سوویٹ حکومت نے اسے بے پروائی کی ہنسی سے ٹال دیا۔ اور کہا کہ مغربی اتحادی خود ہی سابقہ معاہدات کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اس دوران میں برلین کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ مغربی اتحادیوں نے جرمنوں کو ہوائی جہازوں کے ذریعے سامانِ خوراک پہنچانیکی سرتوڑ کوشش کی۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکا راشن میں کمی نہ آنے دی۔ اس کے باوجود معاشی ناکہ بندی کا پوری طرح ازالہ نہیں ہو سکا اور کشیدگی بدستور موجود ہے۔ برطانیہ امریکہ اور فرانس نے روس کو ایک اور احتجاجی مراسلہ بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے سفیر ماسکو روانہ ہو گئے ہیں تاکہ سوویٹ حکام سے براہ راست بات چیت کر سکیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جب یہ لوگ ماسکو پہنچے تو وزیر خارجہ موسیو مولوٹوف کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ ماسکو میں موجود نہیں ہیں۔ سیاسی حلقوں میں اس کے یہ معنی لئے جا رہے ہیں کہ روس کا رویہ معاندانہ ہے اور وہ مغربی اتحادیوں سے کسی قیمت پر بھی صلح نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ اور برلین کے حالات بدستور دگرگوں ہیں۔

تیسری جنگ کا امکان ان واقعات کو دیکھ کر بعض لوگوں کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کیا تیسری جنگ عظیم کا امکان نہیں ہے؟ ایک طرف ان تیاریوں

پر نظر ڈالی جائے جو مختلف قومیں ایک دوسرے سے جنگ کرنے کے لئے کر چکی ہیں اور دوسری طرف اس کھچاؤ کو ذہن میں رکھا جائے جو بین الاقوامی طور پر آپس میں پایا جاتا ہے تو اسی نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ تیسری جنگ عظیم ہو کر رہے گی۔ لیکن کب؟ اس کا جواب دینا آسان نہیں۔ تاہم دو مواد ضرور پک رہا ہے، یہ لاوا جلد یا بدیر پھٹ کر رہے گا۔ البتہ برلین کی کشیدگی ہی کو جنگ عظیم کا محرک قرار دینا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ یہ بیشک صحیح ہے کہ امریکہ نے ایٹم بم تیار کر لیا ہے اور جراثیم کا حربہ بھی مکمل ہو چکا ہے لیکن امریکہ و برطانیہ ابھی تک اُن اثرات کو دور نہیں کر سکے جن کے وہ گذشتہ جنگ میں شکار ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ روس کو بھی اپنی کمزوری کا پوری طرح احساس ہے، وہ بین الاقوامی سیاست کے اکھاڑے میں بے شک دیو بنکر ظاہر ہوتا ہے لیکن ابھی اس کے ناخن اتنے نہیں بڑھے کہ وہ دوسرے کے جسم میں پیوست کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس لحاظ سے قرین قیاس یہی ہے کہ بارود خانہ تو تیار ہو چکا ہے لیکن اس میں چنگاری کونسی منازعت ڈالے گی؟ اس کے جواب کے لئے دنیا کو کچھ دیر اور انتظار کرنا پڑے گا۔

خدشے

شریف کنجاہی

دنیا کے کاروبار ہر روز ہر آدمی کو ایک دوسرے کے اندر جھانکنے کا موقعہ دے دیتے ہیں ـــــ زید چنگا بھلا آدمی ہے۔ خوب باتیں کرتا ہے عقل اور فکر سے کاروبار کرتا ہے لیکن کیوں وہ بعض اوقات تیز ہو جاتا ہے۔ بکر کیوں ماتحتوں کو ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا ہے۔ یہ اور اس قسم کے بیسیوں اور سوالات زندگی ہر انسان کے سامنے لاکر رکھ دیتی ہے۔ اور ہر انسان اپنی بساط کے مطابق انہیں حل کرنے کی کوشش کرتا چلا آرہا ہے۔ اور شاید اسی طرح کرتا چلا جائے گا۔ کبھی اپنی غلطیوں کو غلطیاں ہی تسلیم نہیں کریگا۔ کبھی اعتراف کرے گا۔ کبھی "نادانستہ حرکت" ٹھہرادیا کرے گا۔

یہ نادانستہ اور دانستہ کا معاملہ بھی بڑا بے ڈھب سا ہے۔ کیونکہ آج بال کی کھال اتارنے والے ہماری حرکتوں کو ایک بڑے سمندر سے مثال دیتے ہیں۔ اب اس سمندر کی اوپر کی سطح تو دانستہ یا شعور کہلاتی ہے۔ اور اس سطح کے نیچے تہ تک کا پانی نادانستہ یا لاشعور کی زد میں آجاتا ہے۔ پھر جس طرح نچلے پانی کی رَو ہیں اوپر اُٹھ اُٹھ کر بالائی سطح والے پانی کی حرارت میں کمی بیشی کرتی رہتی ہیں۔

اسی طرح داناؤں کا کہنا ہے۔ کہ لاشعور کے نچلے حصے سے رَو ئیں اُٹھ اُٹھ کر ہماری ان حرکتوں اور خیالوں کو اپنے رنگ میں رنگتی رہتی ہیں۔ جن کو ہم "دانستہ" کا نام دیتے ہیں اور لاشعور ایک اتھاہ سمندر ہے۔ اس میں گزری ہوئی دلچسپیاں۔ بیتے ہوئے دن عیش کے۔ ماضی کے کتنے ہی میٹھے کڑوے واقعات۔ جسم اور دماغ کی کتنی ہی عادتوں کی جڑیں چھپی بیٹھی ہیں۔ پسند۔ ناپسند، پیار۔ نفرت۔ خدشوں اور وہموں کے تمام اسباب اسی درخت کی شاخ ہیں۔ کیوں بعض آدمی بعض چیزوں سے حد سے زیادہ ڈرتے ہیں؟ اس کا جواب بھی لاشعور ہی کے کسی گوشے میں سے ملیگا۔ اس کے علاوہ جنس غصہ حرص وغیرہ وہ تمام طبعی میلان بھی لاشعور کا حصہ ہیں۔ جن کو اپنی ذات میں تسلیم کرنے کے لئے کوئی بھلا مانس تیار نہیں ہوتا۔ لیکن جو ڈنکے کی چوٹ آئے دن اپنی موجودگی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنا آپ منوانے پہ اُدھار کھائے ہوتے ہیں۔

ضمیر کا نام تو آپ نے سنا ہوگا؟ یہ اس باطنی طاقت کا نام تھا۔ جو انسانوں کو ان خیالوں اور شغلوں سے روک ٹوک کرتی تھی جنہیں سوسائٹی بُرا خیال کرتی تھی آج اسے ایک اور نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پرانے وقتوں میں جب مسلمانوں کا ایک دنیا پہ راج تھا۔ انہوں نے شراب کی بندش کے لئے بعض آدمی مقرر کئے ہوتے تھے۔ جو اس ٹوہ میں لگے رہتے تھے کہ کہیں کوئی شراب کی خرید و فروخت کھلے بندوں یا چھپ چھپا کر تو نہیں کر رہا۔ ان لوگوں کو محتسب کہا کرتے

کتے۔ آج اس ضمیر کو بھی اسی رعایت سے محتسب کہا جانے لگا ہے۔ یہ بھی طبعی میلانوں کے کھلے بندوں یا چھپ چھپا کر شعور کی سرحد میں آ جانے کی تاک میں لگی رہتی ہے، اور جہاں شک پڑے اچانک پڑتال کرنے لگتی ہے۔

ضمیر یا محتسب کی موجودگی ہمارے اندر ایک جھگڑا سا کھڑا کر دیتی ہے طبعی میلان اپنا آپ منوانا چاہتے ہیں۔ ضمیر راہ میں حائل ہوتی ہے۔ اور اس طرح دونوں میں ٹھن جاتی ہے۔ اور کشمکش سی شروع ہو جاتی ہے۔ اب جو جھگڑے شعور کی حدود میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو تو آسانی کے ساتھ کسی ایک کے حق میں فیصلہ دینے سے چکایا جا سکتا ہے لیکن لاشعور کی بستی میں کھڑے ہونے والے جھگڑے عام آدمی کے بس کا روگ نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کا اسے علم ہی نہیں ہوتا۔ پھر جس کا علم ہی نہ ہو اس کا فیصلہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ان جھگڑوں کی مثال ان آتشیں مادوں سے دی جا سکتی ہے۔ جو زمین کے اندر پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمیں ان کے وجود کا اسی وقت احساس ہوتا ہے۔ جب وہ ہماری بنائی ہوئی عمارتوں کو لرزا دیتے یا گرا دیتے ہیں۔

لاشعور میں پیدا ہونے والے جھگڑوں کے سرچشمے بے شمار ہیں لیکن ڈر اور خوف شاید سب سے زیادہ پیش پیش ہے۔ بیماری کا ڈر ہونی بات کا ڈر۔ گناہ کا ڈر۔ غریبی کا ڈر۔ بڑھاپے کا ڈر سے ڈر دوستوں کی موت کا۔ ان کی جوانا موت کا۔ وغیرہ۔

ان میں سے کسی ایک صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہم یا تو ڈر کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے بے معنی ٹھہراتے ہیں۔ یا پھر اسے بھول جانے کی اور ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دوسری صورت خطرناک ہوتی ہے کیونکہ اب ہم سانپ کو لاٹھی سے مارنے کی جگہ اسے گویا بل میں گھس جانے کی اجازت دے دی ہے۔ اور ہوسکتا ہے کسی وقت وہ اسی بل سے نکل کر ڈس جائے۔

ڈر اور خوف میں ایک طرح کی مقناطیسی طاقت ہے۔ اس کا ثبوت؟ ذرا اپنے ہی ماضی کی طرف نگاہ ڈالو کسی غلطی کا خیال کرو جو تم سے ہوئی ہو۔ کوئی پیالی ٹوٹ گئی ہو بے موقع بات کہہ دی گئی ہو۔ ع بھری بزم میں راز کی بات کہدی۔ ایک بار تو آپ زبان کو دانتوں میں دبا کر رہ گئے ہوں گے ے

ہے مری چشم حسرت کا سب حال دل ان سے کہہ جانا
کچھ سوچ کے ان کا دانتوں میں ہونٹوں کو دبا کر رہ جانا

اور پھر نکتہ کی بات یہ ہے۔ کہ آپ جس قدر زیادہ احتیاط سے کام لیں گے اسی قدر زیادہ آپ کی حرکتیں بھونڈی بن جائیں گی۔ اور آپ نادانستہ طور پر وہی غلطی کر بیٹھیں گے۔ بات یہ ہے کہ ہم وہی کچھ کرتے ہیں۔ جو ہمارے ذہن میں ہوتا ہے۔ اب ذہن میں وہ بات بھی آسکتی ہے۔ جسے ہم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی طرح کئی بار ہم وہ کچھ کر گزرتے ہیں جو ہمیں نہ کرنا چاہیئے تھا یا جو کرنا چاہیئے تھا۔ اسے کرنا بھول جاتے ہیں۔ اسی عادت کی زد میں ہماری بات

چیت اور حرکتیں ہی نہیں آتیں۔ بلکہ جسم کے وہ کام بھی جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر ذہن کو یہ خیال لے کر ہاضمہ کی طرف لگایا جائے کہ ہاضمہ کا عمل ٹھیک ٹھیک نہیں ہوگا۔ تو عام طور پر بدہضمی کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اور بدہضمی کے بعض عادی بیماروں کے معاملے میں تکلیف کی بناء ان کا یہی یقین ہوتا ہے کہ ان کو کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی۔ اسی طرح جن لوگوں کو ہر وقت یہ خوف کھائے جاتا ہے۔ کہ کہیں کوئی اڑتی بیماری اڑ کر نہ آ لگے۔ وہ ہی اکثر اس کا نشانہ بنتے ہیں اور خوف کے اس اثر کا دائرہ تنگ نہیں ہے۔ سکولوں میں آپ کو ایسے کتنے ہی بچے ملیں گے۔ جو غلط بولنے کی کوشش میں الفاظ کو غلط بول جاتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کی کتنی ہی باتیں ہیں جن سے ہر آدمی آگاہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود کم آدمی اس بات کو ذہن میں جگہ دیتے ہیں۔ کہ کسی ناگوار چیز سے بچنے کا سب سے بڑا طریقہ یہ ہے۔ کہ اس سے خوف کھایا جائے۔ کیونکہ خوف مقابلہ کی طاقت کو فنا کر دیتا ہے۔ اور جس میں مقابلہ کی تاب نہ رہے۔ وہ اپنا بچاؤ کیسے کر سکتا ہے۔

کشمکش دل میں چھڑی ہو یا دماغ میں۔ ہر حال میں آپ کو خوف ایک بنیادی سبب نظر آئیگا۔ دل اور دماغ کا تقاضا ہوتا ہے۔ کہ یوں کیا جائے خوف کہتا ہے خبردار۔ جان کے لالے پڑ جائیں گے اور انجام؟ ایک مستقل کشمکش جو جینا اجیرن کر دیتی ہے۔ اور آخر یاس و نا امیدی کو جنم دے دیتی ہے۔ کسی دن چند لمحوں کے لئے کسی راہگزر پر بیٹھ کر لوگوں کے چہروں کی طرف غور سے دیکھئے ان کی چال

ڈھال کا جائزہ لیجئے۔ آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا۔ کہ کسی انسان کی زندگی کو خوف کھائے جا رہا ہے۔ اس کی ہر بات میں جوش کی کمی۔ افسردگی اور اکتاہٹ جھلک رہی ہوگی ذمّہ داریوں سے آنکھ چرانے والے اور گوشوں میں کھسک جاتے والے لوگوں کو . . . . ان کے دل کی گہرائیوں میں جھانکیں تو صاف نظر آنے لگتا ہے۔ کہ خوف کی چڑیل وہاں ڈیرہ جمائے ہوئے ہے۔ زندگی کے لہریں مارتے ہوئے سمندر میں ہاتھ پاؤں مار کر تیرنے کی جگہ انھوں نے لاش بن کر کسی لہر کے سہارے ساحل پر جا پڑنا گوارا کر لیں اور خوش ہو گئے۔ کہ تھپیڑوں سے نجات ملی۔ بچ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ اور ان کو سزا دینے والے لوگ ان کی مثال ان بزدل سپاہیوں کی سی ہے۔ جو میدان جنگ میں پڑی ہوئی لاشوں کی قسمت پر اس لئے رشک کر رہے ہوں۔ کہ وہ لڑائی کی زحمت سے تو بچ گئے ہیں۔

انسانوں کے کتنے ہی دکھ جاتے نظر آئیں۔ اگر کسی طریقے سے خوف کے بھوت کو اس بستی سے بھگا دیا جائے۔ یہ بھوت چھوٹے بڑوں کے لئے ایک ہی للکار لئے ہے اور قریب قریب ایک ہی انداز سے ان کی زندگیوں کو تلخ بنا رہا ہے۔

ہماری کتابیں!

ادارۂ ادبیاتِ جدید کی طرف سے پورے
ایک سال سے بعض کتابوں کے متعلق یہ
اعلان کیا جا رہا ہے کہ وہ زیرِ طبع ہیں اور اس
اعلان کے نتیجہ میں ہمیں بعض آرڈر بھی موصول ہو چکے
ہیں لیکن بعض ناگزیر حالات اور گذشتہ افراتفری
کے باعث یہ کتابیں ابھی تک شائع نہیں ہو سکیں
—— اب چونکہ حالات نسبتاً سازگار ہو چکے
ہیں اس لئے ادارہ اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش
کر رہا ہے کہ ان مطبوعات کو جلد پبلک کے سامنے
پیش کر سکے۔ خریداروں کی خدمت میں التماس
ہے کہ اپنے آرڈر جلد بھجوائیں تاکہ مذکورہ کتابیں
طبع ہوتے ہی ان کی خدمت میں بھیجی جا سکیں۔

منیجر ادارۂ ادبیات جدید مسلم سٹریٹ سرکلر روڈ لاہور

مضمون نگار حضرات کی خدمت میں ضروری گذارش

۱۹۴۷ء ہمارے ملک اور قوم کی تاریخ میں ایک نقطۂ انقلاب ہے جس سے ہماری زندگی کے سب شعبوں میں ایک تغیرِ عظیم واقع ہو چکا ہے اردو ادب اب اگر زندہ اور حرکی ادب ہے تو اس انقلاب اور تغیر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان واقعات اور حقائق کے پیشِ نظر ہم مضمون نگار حضرات اور شعرائے کرام کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ وہ ایسے مضامین، افسانے، ڈرامے اور منظومات ارسال فرمائیں جن میں اس دور کے معاشی، سیاسی، عمرانی اور علمی رجحانات کی ترجمانی کی گئی ہو۔ کیونکہ عبوری دور کی سیماب نما کیفیات کو سانچے میں ڈھالنا اور انہیں قطعی شکل دینا۔ مفکرین، ادباء اور شعراء کا ہی کام ہے، یہی لوگ اس بارِ گراں کے صحیح معنوں میں متحمل ہو سکتے ہیں۔ امید ہے مضمون نگار حضرات اور شعرائے کرام ہماری اس درخواست کو لائقِ اعتنا خیال کرتے ہوئے اپنے بلند پایہ مضامین ارسال فرمائیں گے، اُن کے مضامین نہایت شکریہ کے ساتھ شاہکار میں درج کئے جائیں گے۔

—————— مُدیر

منظومات

لکھنے والے:-

عبدالحمید عدمؔ
شریف کنجاہی
برجندر سیال
فیضی جہانگیر
امین ہاشمی
اختر ہوشیارپوری
عرشی بھوپالی
حافظ امرتسری
جمیل ملک
شاد امرتسری
محمد صدیق کلیم

گلیوں میں

عدمؔ

شاداب سویرے ہیں
رنگین اندھیرے ہیں
حُوروں کے بسیرے ہیں
لاہور کی گلیوں میں

ہنستے ہوئے کاجل ہیں
اُمڈے ہوئے بادل ہیں
بھیگے ہوئے آنچل ہیں
لاہور کی گلیوں میں

جنّت کی ہوائیں ہیں
جھرنوں کی صدائیں ہیں
پھُولوں کی قبائیں ہیں
لاہور کی گلیوں میں

مہکے ہوئے گیسو ہیں
بہکے ہوئے آہو ہیں
لہکے ہوئے پہلو ہیں

لاہور کی گلیوں میں

آنکھوں میں اشارے ہیں
ہونٹوں میں شرارے ہیں
زلفوں میں ستارے ہیں

لاہور کی گلیوں میں

شفاف شرابیں ہیں
بے داغ کتابیں ہیں
باریک نقابیں ہیں

لاہور کی گلیوں میں

وداع

شریف کنجاہی

آج میں تم کو وداع کرتا ہوں
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے نہیں
اور نہ اُکتائی ہوئی آہوں سے
مسکراتے ہوئے ہنستے ہوئے میں تم کو وداع کرتا ہوں
اس کا یہ مطلب بھی نہیں
کہ میرے دل میں محبت ہی نہیں
رُوح میں کوئی حرارت ہی نہیں
آج اس سینے کی گہرائیوں میں
ایک کسک۔ ایک خلش ہوتی ہے محسوس مجھے۔
جب بھی فرقت کا خیال آتا ہے
اور اس ربط کا اظہار کئے دیتی ہے
جو مجھے تم سے رہا ہے کل تک
آپسی ربط کے ان ریشمی تاروں نے جو ملبوس بنے دل کے لئے
زینتِ زیست رہیں گے وہ تو
پھر بھی ہنستے ہوئے میں تم کو وداع کرتا ہوں
کان میں ہیرا پڑا ہے تو فقط پتھر ہے۔

اور بازار میں وہ لعل گراں قیمت ہے
جس طرح کان وداع کرتی ہے
گود میں پالے ہوئے لعل و گہر
آسماں جس طرح ہر رات وداع کرتا ہے
اپنے سینے سے لگائے ہوئے ان قطروں کو
جن کو ہم اوس کہا کرتے ہیں
اور انہیں قطروں سے
گرد آلود فضائیں بھی نکھر جاتی ہیں
رُخِ ہستی بھی سنور جاتا ہے
میں تمہیں آج وداع کرتا ہوں
تم نے دیکھا ہے کہ اس وقت رُخِ ہستی پر
کس قدر گرد جمی جاتی ہے
حسن گھبرایا چلا جاتا ہے
اور فضائیں ہیں کہ دھندلاتی چلی جاتی ہیں۔
کیا عجب اوس کی صورت تم بھی
اس کے اُٹھتے ہوئے چہرے کو کبھی دھو ڈالو
کیا عجب تم ہی وہ کل گوہرِ نایاب بنو
جس پہ انسانیت ناز کرے فخر کرے
تم مری آرزوئیں ہو میری امیدیں ہو
مسکراتے ہوئے میں تم کو وداع کرتا ہوں

تیرا خط ....

برجندر سیال

تیرا خط باعث دلجوئی نہیں۔ وقت کی تفسیر سہی
شوخیٔ تحریر سہی
ہمنوا۔ تلخ حکایات میں کیا رکھا ہے
ان شکایات میں کیا رکھا ہے
زیست طوفان سہی۔ یاس ہے مرگ بے وقت
شورش طوفاں سے اُلجھ
گردش دوراں سے اُلجھ

مرگ بے وقت نہ مانگ ....

دہر کے بگڑے ہوئے طور ہیں آج
فتنے منہ زور ہیں آج

خود فریبوں نے نکالے نئے آزادی کے طوق
وائے اے تنگیٔ ذوق
گوشت ناخن سے جُدا کر دینا

دوست کو دشمن ارباب وفا کہہ دینا
سادہ حلقوم پہ زنجیر و رسن کے حلقے
قوم و وطن کے حلقے
رہ رہ کور ہے اور سامنے ہے چاہِ عمیق
پاؤں کمزور ہیں اور راہ کٹھن۔ میرے رفیق
پھر بھی چلنا ہے
سنبھلنا ہے ہمیں
بے بسی دکھ کا مداوا تو نہیں
شب تاریک سہی فردائے رنگیں بھی تو ہے
صبح روشن بھی تو ہے
شمع امید لئے اس صبح روشن تک جی
فردائے رنگیں تک جی
بے بسی دکھ کا مداوا تو نہیں

استقبال

فیضی جہانگیر

کون جانے کہ ہے کیوں لکشمی دیوی مسرور
آج سرمایہ پرستوں میں مسرت کیوں ہے ــــــ؟
جبکہ اس پار
اک افلاس زدہ بستی میں
حسرت و نالہ و گریہ کا ہے طوفاں برپا
اس کی بے کیف فضاؤں میں ہے غربت رقصاں ۔
اس کی بے کیف فضاؤں میں ہے چیخوں کا خروش ۔
اس طرف ــــــ کیف میں اور نور میں ڈوبے ہوئے منعم کا محل
اس طرف ــــــ حسرت و یاس میں کھویا ہوا مزدور کا گھر
زیست کی راہ پہ یہ فرق نمایاں کیوں ہے ؟
ہاں مگر آج تو منعم کے محلات میں عشرت کی نئی لہر بڑھی آتی ہے ۔
قہقہے گونجتے ہیں طنز بھرے زہریلے
دم بدم اٹھتے ہیں اٹھتے ہی چلے جاتے ہیں
دور مزدور کی بستی میں کسی نوزائیدہ بچے کی صدا
ان کے کانوں نے سنی ہے شاید ــــــ!

غزل

امین ہاشمی

گذری ہوئی برسات کے دن یاد نہ آئیں
پرواز میں ہیں میکدہ بردوش گھٹائیں

آنکھوں میں ہے عکس مئے گلرنگ کا یہ کیف
یا جھوم کے اٹھتی ہوئی گھنگھور گھٹائیں

اک عالم سرمست لئے اپنے جلو میں
مغرب سے چلی آتی ہیں گھنگھور گھٹائیں

تم پر ہی میری آخری امید لگی تھی
اب کس کو یہ حالِ دلِ مجبور سنائیں

اک عمر حوادث کی نظر ہو گئی میری
کشتی کی مخالف رہیں ہر سمت ہوائیں

ہے سامنے آنکھوں کے نشیمن کا میرے حال
چلتی ہوں موافق کہ مخالف ہوں ہوائیں

انجام محبت کا امینؔ مجھکو ہے معلوم
اس کیف کی دنیا میں وہ اکبار تو آئیں

غزل

اخترؔ ہوشیارپوری

شریکِ حال جب تک دورِ پیمانہ نہیں ہوتا
جہانِ رنگ و بو کچھ بھی ہو میخانہ نہیں ہوتا

محبّت زیست کا عرفان ہے، پیغمبری دل کی
محبت میں جو دیوانہ ہو دیوانہ نہیں ہوتا

دبے پاؤں بہارِ رفتہ واپس آہی جاتی ہے
جہاں ہم بیٹھ جاتے ہیں وہ ویرانہ نہیں ہوتا

سنواری زندگی کی زُلف اکثر دستِ وحشت نے
مکمل آدمی کا پیکر بھی افسانہ نہیں ہوتا

مجھے اخترؔ لئے جاتی ہیں جس عالم میں وہ نظریں
وہاں انساں خرد کھوکر بھی دیوانہ نہیں ہوتا

غزل

عرشی بھوپالی

میری ہمت اک توجہ یہ نگاہِ قاتلانہ
تری بے رُخی پہ صدقے مرا زعمِ عاشقانہ

یہ نوازشیں مسلسل یہ تپاک مخلصانہ
کہیں ہو نہ جائے رُسوا ترا حُسنِ کافرانہ

نہ ہجومِ آہ لب پہ نہ فغاں کا ہے ترانہ
کہ سکونِ درد ہے اب تیری یاد کا بہانہ

کہیں بدگماں نہ کردیں کسی مجرمِ وفا کو
یہ ہر ایک سے مراسم ترے بے تکلفانہ

کئی مسکراہٹیں تھیں کئی زندگی کے پہلو
مرے آنسوؤں کی قیمت نہ سمجھ سکا زمانہ

وہی ظلمتیں ہیں طاری مری شامِ بیکسی پر
شبِ ماہ سے بھی روشن نہ ہوا سیاہ خانہ

رہ و رسم مدتوں سے نہیں خوشگوار لیکن
تری یاد سے ہے ابتک وہی ربط غائبانہ

مجھے اپنی زندگی خود ہے بہت عزیز عرشی
مگر اس حسیں نظر کی وہ ادائے والہانہ

غزل

حافظ امرتسری

اس مکروریا کی دنیا میں - کوئی نہیں اپنا دیوانے
بیگانے ہیں وہ بیگانے - تو جن کو چلا ہے اپنانے

آغاز سے بے پروا ہو کر - انجام سے ہو کر بیگانے
ہر رنگ میں شمعوں کی لو پر - جلتے ہی رہیں گے پروانے

اے دوست فقط اک تیرا ہی - ممنونِ کرم ہوں میں ورنہ
کیا مجھ کو ملا ہے دنیا سے - کیا مجھ کو دیا ہے دنیا نے

احباب کی محفل بھی اب تو - بے رنگ سی ہے بے نور سی ہے
اب کوئی کسے کیا پہچانے - اب کوئی کسی کو کیا جانے

موجوں سے اُلجھنے والے پر - طوفان کے ہاتھوں کیا گذری
آسودۂ ساحل کیا سمجھے - آسودۂ ساحل کیا جانے

اتنا بھی کسی کو ہوش نہیں - اتنا بھی کسی کو یاد نہیں
محفل میں تمہاری کب پہنچے - کب رقص میں آئے پیمانے

بیگانہ روی سے اپنوں کی - حالاتِ زمانہ کے ہاتھوں
حافظ وہ حقیقت بن کے رہے - سمجھے تھے جنہیں ہم افسانے

غزل

جمیل ملک

نہ رہزن کے لئے ہے، نہ راہبر کے لئے
متاعِ زیست مری ہے تری نظر کے لئے

جبینِ شوق کو اذنِ ادا ئیگی بھی تو ہو
کئی سجود ہیں بے تاب تیرے در کے لئے

کبھی ہمیں بھی تھا حاصل کسی سے ربطِ بہم
بچھڑ گئے ہیں مگر اب تو عمر بھر کے لئے

میں اُڑ تو جاؤں قفس کو بھی ساتھ لے کے مگر
ترس رہا ہوں کئی دن سے بال و پر کے لئے

خدا کی آس پہ نکلا ہوں گھر سے اے ہمدم
نہ ہو، نہیں ہے اگر زادِ رہ سفر کے لئے

جمیل کوششِ درماں فضول ہے، یعنی
دوا کوئی نہیں دردِ دل و جگر کے لئے

غزل

شادؔ امرتسری

دوائے دردِ دلِ سوگوار پا نہ سکا
سرورِ وصل بھی غم کو مرے گھٹا نہ سکا

شکستِ خاطرِ کلفت زدہ کا حال نہ پوچھ
تجھے بھلانا بھی چاہا مگر بھلا نہ سکا

الم تو خیر الم ہے مگر یہ دلِ کم بخت
خوشی کے گیت بھی اکثر خوشی سے گا نہ سکا

مدام جلتا رہا ہوں مگر یہ سوزِ دروں
مجھے جلاتا رہا درد کو مٹا نہ سکا

حصولِ کیفِ دل آزاریٔ جفا مت پوچھ
یہ راز وہ ہے کہ جسکو کوئی بھی پا نہ سکا

خدا بھی بھول گیا ہوگا رازِ موت و حیات
تو کیا عجب ہے کہ انساں اسکو پا نہ سکا

عجیب لطف ہے وہ روٹھ کر بھی حیران ہیں
کہ شادؔ ہو کے بھی میں کیوں انہیں منا نہ سکا

سانیٹ

محمد صدیق کلیم

شوق کی بے باکیاں گستاخیاں معذوریاں
عشق کے بے تاب لمحوں کی زباں بے زباں
سوز و سازِ آرزو کی تلخیوں کی داستاں
زندگی کے حادثوں میں کھو گئی جانے کہاں

اب محبت تیز نشتر کی طرح چبھتی نہیں
آج وقفِ سود و سودا دِل کی دنیا ہو گئی
اب کہاں دلچسپیوں کے شوخیوں کے کارواں
آج رنگیں زندگانی اک فسانا ہو گئی

اب وہ پہلی چاندنی کی ساعتوں میں زندگی
پھر ترنم ریز و نغمہ بیز ہو جاتی نہیں
حسن کے اس دیوتا کا اب پیام آتا نہیں
اب ستاروں میں نظر وہ خوش کلام آتی نہیں

وہ کلیم با تجلّی اور بہاروں کا سماں
ایک رنگیں داستاں ہے داستاں ہے داستاں

رباعیات

فخرالدین احمد سعید بی۔ اے

مئے سے دو بھری گلابیاں ہیں آنکھیں
خیام کی دو رباعیاں ہیں آنکھیں
میخانہ کی، مستیوں کی، اور ساقی کی
رومان بھری کہانیاں ہیں آنکھیں

شبنم کے جھلکتے موتی گیندے پہ جڑے
یا اٹکے، ہلال میں ہیں، ٹوٹے تارے
کانوں میں ترے جڑاؤ جھمکے لرزاں
سونے کے ہنڈولے تارے جھولیں جیسے

لہراتی سی سرخیاں کسی کے لب ہیں
پتلی سی دو دھاریاں کسی کے لب ہیں
لیں نذر گلاب کے ہزاروں تحفے
کھلنے کو دو پنکھڑیاں کسی کے لب ہیں

افسانے

لکھنے والے:۔

کشمیری لال ذاکرؔ

میرزا ادیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

احمد کیف

کشمیری لال ذاکر

یہ کھنڈر میرے ہیں

"تم نے سُنی دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز"

"نہیں تو"

"تم ہر وقت غافل پڑی رہتی ہو نجمہ۔ کوئی کواڑ توڑے جا رہا ہے اور تمہیں کچھ بھی خبر نہیں"۔

نجمہ نے کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا۔

"تمہارے کان بج رہے ہیں شاید"۔ اس نے کہا۔

ادہر یوسف چڑ گیا "ہر دفعہ تم مجھی کو بیوقوف بناتی ہو۔ لو سُنو اب کوئی میرا نام بھی پکارے۔ تم اب بھی کہو کہ تم کچھ نہیں سُن رہی ہو"

"میں نے واقعی اب بھی کچھ نہیں سُنا" نجمہ نے مجرمانہ انداز میں جواب دیا۔

"دیکھو تو وہ کیسے چیخ رہا ہے، جیسے ایک تند طوفان کواڑ سے ٹکرا رہا ہو"۔

"شاید میرے کان مجھ سے فریب کر رہے ہیں"

"تمہارے کان تو شروع زندگی سے ہی تمہیں دھوکا دیتے آ رہے ہیں نجمہ۔

تم نے ہمیشہ ہر کسی بات کو ٹالنے کی کوشش کی ہے" یوسف کی آواز میں غصہ کا امتزاج تھا۔

"مگر تمہیں بھی تو پچھلے کئی دنوں سے جانے کیا ہو رہا ہے۔ جس وقت دیکھو ضمیر کی رٹ لگ رہی ہے۔ تم نے تو کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ کسی کے دل کو نہیں دکھایا بلکہ کسی زخمی اور تکلیف سے تڑپتے انسان کی کچھ مدد ہی کی ہو گی اور پھر بھی تمہارا ضمیر بیٹھے جا رہا ہے کتنے بزدل ضمیر کے انسان ہو تم۔ تم اپنے بھائی کے اعمال کے ذمہ دار نہیں"

اس وقت اتنی بات گئے مجھے بلا رہا ہے کوئی۔ مجھے دیکھنا چاہیئے وہ کون ہے" جیسے وہ نجمہ کے اس اشارے کو نظر انداز کر رہا ہو۔

"تو کھڑکی سے جھانک کیجے نا، اگر کوئی ہو گا تو نظر آ جائے گا"

"دیکھتی نہیں ہو کتنا گھور اندھیرا ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک ہر خلا میں رچ گئی ہے ظلمت۔ اتنی بلندی سے نیچے کھڑا کوئی انسان نظر آ سکتا ہے؟ میں نیچے جاتا ہوں"۔

"جانے تمہیں کیوں وہم ہے، آخر نیچے ابا اور اماں بھی تو سوئے پڑے ہیں۔ کوئی ہوتا تو پہلے ان کی نیند نہ ٹوٹتی اور پھر مجھے بھی کچھ سنائی نہیں دے رہا۔ آواز دینے والا کوئی بھوت تھوڑی ہے جو اپنی آواز صرف ایک انسان کے لئے مخصوص کر رہا ہے"۔

"اب بھی کچھ سُنا ہے کہ نہیں۔ وہ ناراض ہو کر جا رہا ہے"

"میں آیا صاحب ذرا ٹھیرئیے" اور یوسف سیڑھیاں اُترنے لگا۔

"سنکی کہیں کے۔ جانے کیا ہو رہا ہے انہیں" اور نجمہ کھڑکی کا سہارا لئے فضا میں رچی ہوئی تیرگی کو گھورنے لگی۔

وہ دیر تک اندھیاری کی تہوں کو ٹٹولتی رہی، دیر تک اندھیاری کی تہیں اس کے دماغ کا احاطہ کئے رہیں اور وقت ان کو چیر کر آگے بڑھتا رہا۔

"کون ہے بھائی اس وقت یہاں آنے والا"

"میں ہوں منوہر"

اور یوسف چیخ اُٹھا "تم ـــ تو ـــ"

اسے تو قتل کر دیا گیا تھا، تم ٹھیک کہتے ہو، مگر تم چیخے کیوں ہو؟ گھبراؤ نہیں یوسف میں تمہارا دوست ہوں۔ واقعی مجھے قتل کر دیا گیا تھا۔ تمہارے سامنے ہی کی تو بات ہے۔ تم اس وقت شاید میرے گھر کی ڈیوڑھی میں کھڑے تھے۔ ذرا اپنا ہاتھ اُدھر کرو۔ محسوس کر رہے ہو میرے زخم کو یہ زخم اگر گولی لگنے سے ہوتا تو شاید اب تک چل گیا ہوتا۔ یہ زہر میں بجھے بھالے کا زخم ہے جس نے میرے سینے کو دونوں طرف سے چھید دیا تھا اور اس کا زہر میری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اسے بھرنے میں کچھ وقت لگے گا ـــ اور یہ بھالا بھی تمہارے چھوٹے بھائی اقبال نے مارا تھا۔ بڑا ہمت

والا لڑکا ہے وہ کہاں ہے آج کل؟ ارے تم خواہ مخواہ گھبرا رہے ہو۔ بتاؤ کہاں ہے اقبال آجکل؟

اچھا تو آج صبح ہی کہیں باہر گیا ہے کتنا تگڑا جوان ہے۔ کس طرح کاٹ رہا تھا لوگوں کے سر، کم بخت جیسے بجلیاں برسا تھا۔ میرا تو جی چاہتا تھا اس کی پیشانی چوم لوں مگر شاید یہی خیال اس کے دماغ میں بھی آگیا تھا اور اُس کے بھالے نے بڑھکر میرے دل کو اپنی زہریلی نوک سے چوم لیا۔ جانے کیا جادُو تھا اس کے اس پیار میں۔ مجھ پر ایک نیند سی طاری ہوگئی ایک پُر اذیت نشہ، لیکن وہ نشہ ہی کیا جو پُر اذیت نہ ہو۔ میں جب جاگا تو میرے سینے کا شگاف خُون اُگل رہا تھا۔ اقبال مجھے بھائی جان کہہ کر پکارا کرتا تھا، میں اس کا بڑا بھائی؛ چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کے سینے میں بھالا چبھویا تھا۔ ہندوستان کی روایات کو اُلٹ دیا تھا۔ وہ انقلابی پارٹی میں کام کرتا تھا نا اس لئے۔ اس نے سوچا اگر لکشمن اپنے بھائی رام کے لئے چودہ برس تک جنگل کی خاک چھان سکتا ہے تو کیا اقبال منوہر کا سینہ نہیں چھید سکتا۔ روایات کی اس بساط کو اُلٹ نہیں سکتا، ان غلط رسموں کو توڑ نہیں سکتا، اس اندھی محبت کا گلا گھونٹ نہیں سکتا۔ اس نے رسموں کو توڑ دیا، اس نے محبت کا گلا گھونٹ دیا، اس نے انسانی ذہنوں میں انقلاب کی ایک چنگاری ڈال دی —— اُف! یہ زخم پھر کیوں دُکھنے لگا؟ شاید اس لئے

کہ میں اسی قصبے میں، اسی گلی میں، اور اسی جگہ پہ کھڑا ہوں جہاں بڑے بھائی کے صدیوں کے اُبھرے ہوئے اقتدار کو روندا گیا تھا۔ یہ میرا کچلا ہُوا احساس بُری تری تڑپ رہا ہے اس زخم میں، مگر کون دیکھتا ہے احساس کی تڑپن کو!

کیا کہا اس کے لئے تم شرمندہ ہو۔ تمہارا ضمیر تمہیں کئی دنوں سے کوس رہا ہے۔ تم رات کو گہری نیند سو نہیں سکتے۔ تمہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک انجانا ہاتھ زہر بجھا بھالا تمہارے سینے کی طرف تانے تمہاری طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن وہ اسے تمہارے سینے میں چبھوتا نہیں۔ تم چاہتے ہو کہ وہ اس بھالے کو تمہارے جسم میں پیوست کر دے مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ کئی بار تم نے خود اسے پکڑ کر اپنے جسم میں گاڑنے کی کوشش کی ہے لیکن ہر بار وہ ہاتھ غائب ہو گیا ہے اور تم نہیں جانتے کہ کس کا ہاتھ ہے وہ۔

یہ ہاتھ اس وقت حرکت میں آئے گا، یہ بھالا اُس گھڑی تمہارے سینے کے پار ہو گا جب تم اس سے بچنے کی کوشش کرو گے۔ جب تم خود ڈر کر خود کو اندھیرے غاروں میں چھپاؤ گے اس وقت یہ پرچھائیں کی طرح تمہارے پیچھے دوڑے گا، تمہارا گلا دبوچے گا یہ انجانا ہاتھ، اس لمحہ تمہارے سینے کو زخمی کرے گا یہ بھالا۔ ابھی نہیں، ابھی تمہیں میرے زخم کی سُرخی نظر آ رہی ہے، ابھی تمہیں جسم میں پھیلے ہوئے زہر کا احساس ہے ——
لیکن تم اپنا ہاتھ میرے سینے سے کیوں ہٹا رہے ہو؟ اپنے زخم پر تمہارے

ہاتھ کی ٹھنڈک کو محسوس کر کے مجھے کچھ سکون ہو رہا ہے۔ کیا کہا تمہارا ہاتھ بھی خون سے بھر جائے گا۔ لیکن اس خون سے تم انسانیت کی دیوی کے ماتھے پر بندی لگا سکتے ہو۔ اس ہاتھ نے خنجر نہیں گھونپا زخم سے چھوٹتی ہوئی دھار کو روکا ہے۔ تمہارے کپڑوں پر پڑے ہوئے یہ چھینٹے تمہیں ہرگز ملزم نہ بنائیں گے۔ جب تم خون آلود کپڑے پہنے لوگوں کے درمیان کھڑے ہو گے تو تمہاری قمیص پر خون کا ہر اک داغ ایک ستارہ بن کر چمکے گا اور چاروں طرف یہ چھائی ہوئی ظلمت گھٹ جائے گی ـــــ ابھی رہنے دو اپنا ہاتھ میرے سینے پر۔ یہ زخم کئی صدیوں تک مندمل نہ ہوگا اس میں سے خون کی بوندیں ٹپک کر وقت کی ریت میں جذب ہوتی رہیں گی اور مدھم آوازیں دھراتی رہیں گی، ہم اس بدبخت انسان کے خون کی بوندیں ہیں جس کا خون بہانے والا خود اس کا بھائی تھا۔

تم نہیں جانتے میں نے کیوں اس اندھیری رات میں بارہ بجے تمہیں تکلیف دی ہے۔ تم خواہ مخواہ نجمہ بھابھی پر ناراض ہو رہے تھے۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی کہ کوئی بھوت بلا رہا ہے تمہیں۔ اگر کوئی انسان بلاتا تو اس کی آواز صرف نجمہ ہی نہیں تمہارے گھر والے بھی سن سکتے۔ تمہیں اس پر کیوں غصہ آ رہا تھا۔ وہ ان آوازوں کو نہیں سن سکتی، اس کی روح پاکیزہ ہے، اس کے خیالات بلند ہیں، اسے ضمیر کا کھٹکا نہیں۔ ہاں تو جاؤ اور اسے کہنا کہ منوہر

تمہیں ملنے آیا ہے۔ اسے شاید یہ سُن کر حیرت بھی ہو۔ میں ابھی تمہارا کچھ وقت اور ضائع کروں گا۔ کیوں۔ مجھے بھابھی کو کچھ نہیں کہنا چاہیئے، نہ کہو، لیکن وہ فکر کرتی رہے گی۔ وہ دیکھو بیچاری کھڑکی سے لگی کب سے نیچے اندھیری گلی میں جھانک رہی ہے، اندھیرے کی تہوں کو ٹٹول رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے اسے کچھ نظر نہیں آ رہا، صرف تمہاری آواز سُن رہی ہے، میری آواز کو تو وہ سُن ہی نہیں سکتی۔ تمہارے بولنے سے وہ اندازہ کر رہی ہے کہ تم ابھی محفوظ ہو اور اپنی ڈیوڑھی میں کھڑے کسی سے باتیں کر رہے ہو۔ چلو تمہاری مرضی۔ اگر تم اسے کچھ نہیں بتانا چاہتے تو میں کیوں مجبور کروں۔ اچھا تو آؤ ذرا گھوم آئیں۔ مجھے اس جگہ کھڑے زخم میں زیادہ درد محسوس ہوتا ہے۔ اس گلی سے نکل کر تم بیشک اپنا ہاتھ میرے زخم سے اُٹھا لینا۔

ہیں! ابھی تک ان مکانوں کو تم لوگوں نے بنوایا نہیں۔ اب تو یہ تمہاری ملکیت ہیں۔ اب ہر ایک جھونپڑے کو محل میں بدل دو، یہ جلے ہوئے، گرے ہوئے مکان، یہ بکھری ہوئی اینٹیں اب اچھی نہیں لگتیں۔ انہیں اکٹھا کرو۔ ان گری دیواروں کو پھر سے بناؤ۔ شاندار مکان بن جائیں گے۔ یہ تو محلے کا محلہ ویران پڑا ہے۔ تم لوگ کس طرح رہتے ہو اس ویران اور سنسان ماحول میں۔ اب ان کھنڈروں کو آبادی میں بدل دو تاکہ یہ پھر قہقہوں اور نغموں سے گونج اُٹھیں۔ ان کے آنگن بچوں کے شور و غل سے بھر جائیں۔ انہیں پھر سے

تعمیر کر دو۔ میں تمہاری طرف آتے راستے میں اس پیپل والے کوئین کے پاس میدان میں سینکڑوں خیمے لگے دیکھے ہیں۔ میں اُن میں کچھ عرصہ گھوما بھی ہوں، وہاں تو کڑاکے کی سردی ہے بھائی۔ ان لوگوں کو بھی چھتوں کی اوٹ چاہیئے۔

ایک بچہ اپنی ماں سے کہہ رہا تھا

"بڑی سردی لگ رہی ہے ماں"

'بیٹا کل مِل جائے گا کمبل، آج کی رات یہ چادر اوڑھ کر ہاتھ پیر سکیڑ لو۔

"مگر یہ تو بالکل پھٹی ہوئی ہے"

یہ پھاڑی بھی تو تمہیں نے ہے، کھینچ کھینچ کر پھٹ جاتی ہے چادر"

پھٹ گئی نا کھینچ کھینچ کر آخر یہ چادر۔ کوئی نہ مانتا تھا اس وقت —

اس بوسیدہ چادر کو نہ کھینچو اس سے بھوکا، ننگا اور بیمار ہندوستان ڈھکا ہوا ہے۔ لوگ صرف چادر دیکھ رہے ہیں، انہیں صرف خول نظر آ رہا ہے، انسان کی عزت اس کا ظاہری خول ہے —— تم نہیں مانے تم نے اس خول کو اُتار دیا اور دنیا کے سامنے بھوک سے بلکتی ہوئی ایک عریاں اپاہج عورت کھڑی کر دی، تم نے اپنی ماں کی بے حرمتی کی ہے اور ماں کی عزت لوٹنے والے جہنم کی آگ میں جھونکے جاتے ہیں۔

میں ایک اور خیمے کے آگے سے گزرا

"نہیں ایک چھوڑ دس کمبل دوں گا میری جان"

"تم ہر روز ٹال دیتے ہو"

"وہ بیماروں کے پرانے کمبل تھے کل جائے"

"تم نے وہ بھی نہ دیئے، میں ہر رات سردی سے اکڑتی ہوں"

"صبح نئے کمبل آ رہے ہیں، بس پانچ کمبل تمہارے نام درج ہو جائیں گے"

"اور اگر کل بھی نہ ملے"

"تو تم یہ میرا کمبل لے لینا۔ یہ آسٹریلیا کی اون کا بنا ہوا ہے۔ جہاں کی اون دنیا کی بہترین اونوں میں سے ہے، اس میں اتنی گرمی ہے جتنی تمہاری چھاتی میں، لگا دو اسے میرے سینے کے ساتھ۔

"اگر مجھے حمل ہو گیا تو"

"کبھی عقل کی باتیں بھی کیا کرو"

ایک عصمت لٹاتی —— ہوئی مجبور عورت عقل کی باتیں کہاں کر سکتی ہے اس کڑاکے کی سردی سے بچنے کے لئے وہ خود کو بیچ رہی ہے۔ ہم چیخ چیخ کر کہتے تھے —— اس لپی پتی جھونپڑی میں گذارہ کر لو، اکھٹے رہنے میں برکت ہے، تمہاری لڑکیاں، تمہاری بہوئیں یہاں اندھیری کوٹھڑیوں میں رہ کر محفوظ ہیں۔ اپنے آنگن کی رانیاں ہیں یہ عورتیں۔ جب یہ آنگن میں چرخہ کاتتی ہیں تو دنیا کا امن و سکون پالتو بلی کی طرح ان کے پاؤں میں خرخرانے لگتا ہے۔ مانا اس جھونپڑی میں صرف دو تین کمرے ہیں اور تمہارا خاندان پہلے کی نسبت

کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے، لیکن تمہارا بھلا اس میں ہے کہ پہلے کی طرح مل جُل کر یہیں گذارہ کرتے رہو، بٹوارہ نہ کرو۔ بٹوارہ، خود غرضی کی، خود غرضی فساد کی، اور فساد تباہی کی جڑ ہے ــــ لیکن کوئی نہ مانا۔

اندھیری کوٹھڑیوں میں باپ دادا کے وقت کا پڑا ہوا سامان گلی میں ڈھیر کر دیا گیا۔ صحن کی چار دیواری میں رہنے والی بچیاں چوک میں کھڑی کر دی گئیں۔ ننگی عورتوں کا جلوس اس لئے نکالا گیا کہ تم نے انہیں چوک میں کھڑا کر دیا۔ تم نے انہیں اندھیری کوٹھڑیوں سے باہر نکال دیا۔ تم نے ان کے جسم سے پرانا نقاب اُتار ڈالا۔ تم نے اپنے بزرگوں کی کمائی کو بانٹ لیا۔ تم نے اپنے باپ دادا کی وراثت کے ٹکڑے کر دیئے۔ اب آنکھیں کیوں نیچی کرتے ہو۔ وہ دیکھو ہنس رہے ہیں اجنبی لوگ تم پر۔ دیکھتے ہو اُن کے سرخ چتکبرے چہرے، جیسے جذام کے داغ ہوں۔ وہ جذام کے داغ چمک رہے ہیں، دہک رہے ہیں وہ انگارے۔

پھر میں ایک اور خیمے کے آگے سے گذرا۔ رات اتنی آگے بڑھ چکی تھی اور سارے کیمپ میں لوگ جاگ رہے تھے۔

"وہ اب تک نہ سو سکے تھے

"اس ٹرنک میں تو ہے ہی کچھ نہیں"

"ناحق پریشان کیا کم بختوں نے"

"دوسرے تالے کو بھی چابی لگتی ہے کہ نہیں"

"نہیں"

"تو چلو کسی اور خیمے میں چلیں، آج کی رات خالی تو نہ جائے"

تین آدمی اپنے ہی ایک بھائی کو لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم کہتے تھے تمہاری زمینوں میں اس لئے اتنے بڑے کھلیان لگے ہیں کیونکہ ان میں سارے خاندان کی مشترکہ محنت لگ رہی ہے۔ تم نے بنگال میں بھوک سے مرنیوالوں کو اس لئے بچا لیا تھا کیوں کہ تمہارے گندم کے ہر دانے میں ماں کی مامتا اور بھائی کا پیار تھا۔ لیکن تم نے کہا ـــــ اتنے بڑے بڑے کھلیانوں کا بوجھ بوڑھی دھرتی اب برداشت نہیں کر سکتی۔ انہیں الگ الگ کر کے رکھنا چاہیئے۔ ہم نے تمہیں بجلی کے گرنے کا خوف دلایا، آگ لگ جانے کی بات کہی، طوفان اور آندھی اٹھنے کا ڈر دکھایا، لیکن تم نہ مانے۔ تم نے کھلیانوں کے ٹکڑے کر لئے۔ مٹھی بھر دانے حصہ میں آئے۔ ان دانوں سے بچا سکتے ہو اپنی جنتا کو، کر سکتے ہو ان بے گھر لوگوں کی رکھوالی؟ اب انھوں نے بانٹنا، جلانا، اور لوٹنا سیکھ لیا ہے، اب وہ ہر شتے کو بانٹیں گے، ہر مکان کو جلائیں گے، ہر گھر کو لوٹیں گے۔ ہر عمارت کو کھنڈر بنائیں گے۔

تم نے بوڑھی ماں کا آخری عمر میں منہ کالا کیا ہے، تم نے گدھ بن کے اس کے جسم کی ایک ایک بوٹی نوچی ہے، تم نے کتوں کی طرح اس کے

گوشت کو چھوڑا ہے، اور پھر تم اسے ننگا کر کے اسے فاقوں مار کے، اپاہج کر کے کڑاکے کی سردی میں کھلے میدان میں پٹک آئے ہو۔ یہ ماں صرف تمہاری ہی نہیں میری بھی ہے، ہر ہندوستانی کی ہے، ہر ہندو اور مسلمان کی ہے صرف تم نے ہی نہیں ہم نے بھی اپنی ماں کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔ میں کل رات تمہیں ہندوستان کے ایک کیمپ میں لے چلوں گا۔ تم ڈرتے کیوں ہو میں اُڑ سکتا ہوں۔ تم میرے کاندھوں پر بیٹھ جانا۔ ایک مسلمان ایک ہندو روح کے کاندھوں پر بیٹھ سکتا ہے، ایک ہندو ایک مسلمان کا سہارا لے سکتا ہے مُردوں کا کوئی مذہب نہیں اور مذہب ہمیں مُردوں کی طرف دھکیلتا ہے۔ جبھی تو میرے ساتھ کئی ہزار مُردے ہیں اور انہیں خود معلوم نہیں کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ ان سب کے جسموں پر مختلف حصوں میں گہرے گہرے داغ ہیں۔ ان کی موت کے امین۔ اور داغ میں تو صرف جلن ہوتی ہے گیتا کے شلوک قرآن کی آیتیں اور گرنتھ صاحب کی بانی نہیں —— تم میرے ساتھ چلنا میں تمہیں دکھاؤں گا کہ وہاں بھی انسان ایک دوسرے کو لوٹ رہے ہیں اور کیمپ چلانے والے افسر جو پاکستان میں سب کچھ لٹا کر گئے ہیں رات کو ریشمی بستر میں سوتے ہیں۔ جو اپنی عورتیں یہاں چھوڑ گئے ہیں اور خود بزدلوں کی طرح جان بچا کر بھاگ گئے ہیں، وہ مظلوم اور دکھی عورتوں کی عصمت لوٹتے ہیں، جو یہاں سے قلاش ہو کر گئے ہیں وہ کھانڈ، تیل اور گندم کے گوداموں کے مالک ہیں —— شرم

تو مجھے بھی آتی ہے لیکن میں مرچکا ہوں اس لئے زیادہ نہیں۔ تم زندہ ہو اس لئے زیادہ محسوس کرتے ہو۔ احساس کا تیکھاپن ہی تو زندگی کا ثبوت ہے ذرا کم محسوس کیا کرو۔ تم نے اپنے بچوں کا مستقبل سوچنا ہے، تم نے نجمہ بھابی کو بھی تسلی دینی ہے، جس کے بہن بھائی ہندوستان سے یہاں پہنچنے کی کوشش میں راستے میں بیرحمی سے قتل کر دیئے گئے اور ان کی لاشیں کئی دنوں تک امرتسر میں ریل کی پٹڑیوں پر کُتے گھسیٹتے رہے۔ تم اپنے ملک کے نیک شہری ہو، تم نے لوگوں کو سکھانا ہے کہ وہ نیک شہری کس طرح بن سکتے ہیں۔

یہ سامنے والا مکان کس کا ہے؟ کیا کہا میرا ہی ہے۔ اتنے کھنڈروں میں کہاں پہچانا جاسکتا ہے اپنا کھنڈر۔ اس پر اگر اور کسی کا نہیں تو تمہارا تو حق تھا۔ تم نے ہی اُسے بنوالیا ہوتا۔ تم میرے بھائی ہو، اقبال میرا بھائی ہے، جس نے میرے سینے کا سلگتا ہوا یہ زخم مجھے دیا ہے، کیا تم میرا سلگتا ہوا مکان نہ سنبھال سکتے تھے۔ جواب دو، تم خاموش ہو، لیکن میں تمہاری خاموشی میں اُبلتے ہوئے گرم آنسوؤں کو دیکھ رہا ہوں۔ خون کی بوندیں بھی گرم ہوتی ہیں۔ شعلے بھی تو گرم ہوتے ہیں۔۔۔ میں اس لئے آج تمہارے پاس آیا ہوں، کہ شاید تم مجھے بتا سکو کہ میرے قتل کر دیئے جانے کے بعد میرے گھر والوں پہ کیا گذری۔ اُن میں سے کوئی بچا بھی کہ نہیں۔ میں ہندوستان کے تو سب کیمپوں میں گھوم آیا ہوں، وہاں تو مجھے اپنا کوئی نہیں ملا، بتاؤ وہ سب کہاں ہیں؟ میری بہن ہمشیرا کہاں ہے؟ تمہاری آواز کیوں رندھ رہی ہے۔ تم بے قصور ہو

تم اکیلے درندوں کے اس غول کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ـــــ کیا کہا اس چوک میں ننگا کھڑا کیا گیا اور اس نے مرتے دم تک آنکھیں نہ کھولیں، ظالم اس کے ساتھ ہر قسم کا برا برتاؤ کرتے رہے لیکن اس کی آنکھیں جیسے مل گئی تھیں۔ اور تم اپنی چھت پر کھڑے دیکھ رہے تھے، اور اس کی چھاتیاں کاٹی جا رہی تھیں، اس کے جسم میں بھالے گاڑے جا رہے تھے۔ وہ چیخ رہی تھی لیکن یہ نہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے اپنے محلہ دار ہی اسکو اس بیرحمی سے قتل کر رہے تھے، وہ لوگ جنہیں اب تک وہ چاچا، بھائی اور موسے کہتی چلی آئی تھیں، اسے بازار میں ننگا گھسیٹ رہے تھے۔ ـــــ اور پھر نجمہ بھابی زور سے چیخیں، نجمہ کی سہیلی تھی نا سمترا۔ اکیلے بیٹھ کر سلائی اور کشیدے کا کام کیا کرتی تھیں۔ تب تو مجھے اقبال کا اور احسانمند ہونا چاہیئے۔ شاید وہ جانتا تھا کہ سمترا کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ اس لئے سب سے پہلے اس نے مجھے مار ڈالا اور اس خوفناک واقعہ کو دیکھنے سے پہلے فنا کی نیند سلا دیا۔ ہزاروں آدمی فنا کی نیند سلائے گئے ہیں لیکن وہ سب جہنم میں زندہ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی مرا نہیں۔ وہ ہر روز تیز سے تیز شعلے اور مادے ایجاد کر رہے ہیں۔ وہ ایک خوفناک سازش کر رہے ہیں اس دنیا میں بسنے والوں کے خلاف۔ میں کبھی کبھی چھپ کر اس کی طرف آجاتا ہوں یہ دیکھنے کے لئے کہ اب آناد قومیں ارتقاء کی کونسی منزل پر پہنچی ہیں

کیا انہوں نے جہنمیوں کے ایٹم بم کے مقابلہ کے لئے کوئی مادہ تیار کیا ہے بڑا خوفناک ہوگا ان کا حملہ یہ میں تمہیں بتا دوں۔ اودھر کے لوگوں کو تو میں کئی دنوں سے کہہ رہا ہوں۔ لیکن وہ دھیان نہیں دیتے۔ وہ زندگی کے ایک بھیانک موڑ پر کھڑے ہیں۔ آج ادھر بھی آ گیا ہوں شاید یہاں کے رہنے والوں کے ہوش و حواس قائم ہوں ۔۔۔ یاد رکھو کہ ایک جہنمی صرف جہنمی ہے، ہندو اور مسلمان نہیں۔ وہ ذات پات کے امتیاز سے بالاتر ہے، وہ مذہب کو پاگل پن کی ایک سٹیج سمجھتا ہے۔

اچھا تو ہمترا نے آن رکھ لی میری اور جب بلوائی اس کی ہمت دیکھ کر جھلا اُٹھے تو انہوں نے میرے مکان کو آگ لگا دی۔ سوائے نندہ اور گڈی کے سب اُس میں جل گئے۔ میری ماں میرا باپ اور میرے چھوٹے بھائی سب اس میں راکھ ہو گئے۔ ان کی چیخیں بند کمرے میں سے اُبھرتی رہیں اور تمہارے دروازوں سے ٹکراتی رہیں۔ لیکن تم سب بے بس تھے۔ بجمہ بے بس تھی۔ پھر تم نے دیکھا نندہ اور گڈی کو فضلا اپنے ساتھ گھسیٹے لئے جا رہا تھا۔ اس نے ان کو شعلوں کی زد سے بچا لیا تھا۔ ذرا اونچا بولو۔ کیا ہو رہا ہے تمہاری آواز کو۔ اچھا پھر اس نے ان کی جان بچانے کا معاوضہ مانگا۔ کہنے لگا میں نے منوہر کی زمینوں میں ہل چلایا ہے۔ اس کے اناج کا آدھا حصہ لیا ہے۔ اس کی جائداد کا آدھا حصہ بھی میں لوں گا۔ اور اس کی

جائداد میں سب سے قیمتی اور خوبصورت چیز نندہ ہے اس کی بیوی۔ اب یہ میرے گھر میں رہے گی اور میری بھوک مٹائے گی۔ جب میں اس کی حویلی میں جایا کرتا تھا تو مجھے دیکھتے ہی جانے کونسی کوٹھڑی میں چھپ جاتی تھی۔ اب میں سر بازار اسکو ساتھ لے گھوموں گا ــــــ اور اب وہ ہر روز اس کو پیٹتا ہے۔ مجھے لے چلو مرزا فضلے کے مکان کی طرف۔ میں نندہ اور گڈی کو دیکھ آؤں۔ ایک عرصہ سے نہیں دیکھ سکا۔ تم اندھیرے کی فکر نہ کرو۔ اگر میں تمہیں اندھیرے میں دیکھ سکتا ہوں تو انہیں بھی دیکھ سکوں گا اور مجھے کوئی نہ دیکھ پائے گا۔

اچھا تو وہ کھڑی چارپائی پر سوئی ہوئی ہے گڈی۔ یہ میری ہی گڈی ہے۔ نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو، یہ تو کوئی پلہ نظر آتا ہے۔ مگر میں نے اس طرف بھی تو ایسے پلے دیکھے ہیں۔ یہ ضرور گڈی ہی ہو گی۔ وہ سوئی پڑی ہے میں اسے چوم نہ لوں۔ نہیں میرے چومنے پر وہ جاگے گی نہیں، وہ سوئی رہے گی، اگر وہ جاڑے کی راتوں میں کھڑی چارپائی پر سونا سیکھ گئی ہے تو ــــــ

ہاں اور یہ نندہ ہے اور اس کے سرہانے کون کھڑا ہے، فضلا؟ میرا مزارعہ۔ چھری چوری اٹھا کر آیا ہے نندہ کو دق کرنے کے لئے۔ اس کی ماں اس کو ہر روز کہتی ہے کہ وہ نندہ کو ہندوستان بھیجدے۔ اس کی بیوی اسے کہتی ہے کہ یہ شریعت کے خلاف ہے۔ لیکن وہ نہیں مانتا۔ وہ اب

بھول گیا ہے کہ نمبردار کی ڈکیتی کے سلسلہ میں اسے میں نے بچایا تھا۔ نہیں تو کسی جیل میں سڑتا ہوتا اب تک حرامی۔ وہ رات کے اندھیرے میں ننده کو ستانے آجاتا ہے۔ شاباش ننده! تو نے دگا دیا ایک تھپیڑا اس شیطان کے سر پر۔ میرا بس چلتا تو میں اس ذلیل انسان کو کچا چبا جاتا۔ لیکن میں تو صرف دیکھ سکتا ہوں کچھ کر نہیں سکتا۔ ہاں تم ٹھیک کہتے ہو اب وہ اسے پیٹ نہیں سکتا۔ اس طرح شور مچ جائے گا اور اس کے گھر والے جاگ پڑیں گے۔ اس کی ماں گالیاں دینا شروع کر دے گی۔ اور اس کی بیوی پیٹ کر خود کو ہلکان کرلے گی ——— لیکن آخر یہ مدافعت کب تک؟ ایک دن یہ جذبہ مر جائے گا اور میری بیوی اس کے پہلو ——— تو پڑی رہ ننده اسی میلی کچیلی گودڑی میں۔ تو مر نہیں سکی، یہی تمہاری بزدلی ہے اور بزدلوں کو زندگی میں ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ رمترا میری بہن تھی، وہ آن پہ مر گئی۔ اس کا اور میرا خون ایک تھا۔ تو نہیں مر سکی۔ تو شاید میرے خون کی سرخی کو زندہ رکھنا چاہتی ہو۔ تو گڈی کو مرتے نہ دیکھ سکتی تھی۔ ایک ماں شاید اپنے بچے کی خاطر ذلیل بھی ہو سکتی ہے۔ میں شاید تمہاری مجبوری کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ ہماری بوڑھی ماں بھی دنیا کے سامنے ذلیل ہوئی ہے، صرف اس لئے کہ وہ اپنے بچوں سے زیادہ پیار کرتی تھی، اور ان بچوں نے کیا سلوک کیا ہے، اس کے ساتھ۔ تم ناحق گڈی کی خاطر ذلیل ہو رہی ہو۔

گلا گھونٹ دو گڈی کا۔ اب تو ہندوستان کی روایات ہیں انقلاب آگیا ہے۔ اب اگر بچے اپنی ماں کی بے حرمتی کر سکتے ہیں، اسے گدھوں کی طرح نوچ سکتے ہیں تو ماں ایک معصوم گڑیا سی لڑکی کا گلا نہیں گھونٹ سکتی۔ اس کی موت کے بعد تمہارا مرنا آسان ہو جائے گا۔

نہیں اب میں اپنے مکان کی طرف نہیں جاؤں گا۔ وہاں میرے ماں باپ اور بھائیوں کی جلی ہوئی ہڈیاں اب بھی مٹی میں دبی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے۔ وہ مر گئے ہیں اس لئے ان کا اتنا دکھ نہیں۔ انہیں میں جہنم میں جا کر تلاش کروں گا۔ مجھے معلوم نہ تھا جنہیں میں دوڑ دوڑ ڈھونڈ رہا ہوں وہ میرے قریب ہی بستے ہیں۔ دراصل وہاں اب اتنے لوگ آ گئے ہیں کہ کسی کو ایک دوسرے کی سدھ نہیں۔ میں انہیں ہندوستان کے مختلف کیمپوں میں تلاش کرتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ تم نے انہیں کسی نہ کسی طرح حفاظت سے ہندوستان بھجوا دیا ہو گا۔ اب میں انہیں تلاش کروں گا۔ وہ بھی ضرور جہنمیوں کی اس سازش میں شریک ہوں گے۔ اگر وہ اب تک شریک نہ ہوئے تو میں انہیں روکنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن وہ شاید نہ مانتے آخر وہ اقبال کا دوست تھا نا ۔۔۔۔ لیکن متھرا تو یقیناً جہنم میں نہیں۔ اگر وہ وہاں ہوتی تو اب تک مجھے مل گئی ہوتی۔ اسے ڈھونڈنے کے لئے ابھی جانے کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا ۔۔۔۔ اور پھر یہ نندو تو مجھے نظر نہ آئے گی۔ میں چند

سکے اور اسے جی بھر کے دیکھ لوں - کاش یہ میری آواز سن سکے اور صبح ہونے سے پہلے گڈی کا گلا گھونٹ دے - ہاں وہ دیکھ رہی ہے اس طرف - اسے میں نظر نہیں آ سکتا لیکن میرے خیالات اس کے دماغ سے ضرور ٹکرائیں گے، اس کے دل میں ضرور اس ماحول اور ذلیل زندگی کے خلاف شعلے بھڑکیں گے -

تم ابھی ابھی تمام مکانوں کو گرا دینے کی بات کہہ رہے تھے - تم چاہتے ہو کہ جو مکان شعلوں سے بچ رہے ہیں انہیں بھی جلا دیا جائے، اور کھنڈروں میں بدل دیا جائے - پھر تو سارا قصبہ کھنڈرات کا ایک مجموعہ بن کے رہ جائے گا - تم شاید ان کی تعمیر نئے ڈھنگ سے کرنا چاہتے ہو تم سمجھتے ہو کہ ان کی بنیادوں میں کہیں کوئی آتشی مواد ہے جو پھر کبھی بھڑک اٹھے گا - لیکن ابھی ایسا نہ کرنا، نہیں تو گھروں میں اطمینان سے رہنے والے کچھ لوگ بھی کڑاکے کی سردی میں ٹھٹھریں گے، بھوک سے بلکیں گے اور غربت سے الجھیں گے —— ابھی چند روز اور انتظار کرو شاید جہنم کے باسی اپنی سازش جلد مکمل کر لیں - ان کا آخری وار بھی سہہ لو - اس کے بعد تعمیرِ نو کا خیال کرنا - ابھی یہ بھوکی ننگی اور اپاہج عورت مری نہیں - ابھی اس میں زندگی کے آثار موجود ہیں - اسے مکمل طور پر مر لینے دو پھر گاڑ دینا اسے قبر کی تاریک گھٹن میں - ابھی یہ کچھ کچھ زندہ ہے اور زندہ انسان کو قبر میں

گاڑنا قرون وسطیٰ کی باتیں ہیں اور تم اب مہذب ہو، آزاد ہو اور بیسویں صدی کے رہنے والے ہو۔

رات ختم ہو رہی ہے، ٹھیک ہے تمہارا اندازہ۔ تمہیں بھی میں نے آج رات بہت تکلیف دی۔ نجمہ بھابی جانے کس فکر میں ہوگی۔ اب اس سے میرا ذکر نہ کرنا۔ وہ تمہاری باتوں پر اعتبار نہ کرے گی، اور اس پر ناراض نہ ہوا کرو ــــــ نیک عورت ہے وہ اپنی جاں بلب ماں کی عزیز بیٹی ہے، اسے کوسنے دیکر مرتی ہوئی ماں کو دکھی نہ کرو ــــــ میں نے بھی آج معمول سے زیادہ وقت جہنم سے باہر گذار دیا ہے۔ سب جہنمی شعلے اگلتی آنکھوں سے میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ انہیں پہلے سے ہی مجھ پر شک ہو رہا ہے۔ جو جہنمی دیر سے پہنچے اس کے جسم کے زخم میں گرم گرم سلاخ گھونپ جاتی ہے۔ بڑی دلدوز چیخیں ہوتی ہیں۔ مجرم کی۔ آج یقیناً میرے زخم میں بھی تپتی ہوئی سلاخ ٹھونسی جائے گی۔ لیکن آج شاید مجھے اتنی تکلیف نہ ہو۔ آج تمہارے سرد ہاتھوں نے میرے زخم کی جلن بہت حد تک گھٹا دی ہے۔ ایک بار پھر رکھ دو اپنا ہاتھ میرے سینے کے شگاف پر ہاں ایسے ہی ذرا اور دبا کر ــــــ بس ..... اچھا کل تک خدا حافظ۔

گِردو پیش

میرزا ادیب

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

کِردار:۔

نگہت ـــــــــ یوسف کی چھوٹی بہن

مریم ـــــــــ نگہت کی خالہ زاد بہن

یوسف ـــــــــ نگہت کا بڑا بھائی

ماں ـــــــــ

زرینہ ـــــــــ نوکرانی

منظر:۔ یوسف کا ڈرائنگ روم

[کمرہ نہ تو خاص طور پر آراستہ و پیراستہ ہے اور نہ فرنیچر کے لحاظ سے بالکل عام اور معمولی ہے۔ جس وقت پردہ اُٹھتا ہے یوسف کمرے کے وسط میں سر جھکائے کرسی میں بیٹھا ہے، اور اس کے سامنے میز پر اخبار پھیلا ہوا ہے جس کے ایک حصّے پر اسکی نگاہیں

جمی ہیں۔ اخبار دیکھنے کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز پڑھنے کی بجائے وہ کسی خیال میں غرق ہے۔

یوسف خوش پوش نوجوان ہے۔ عمر ستائیس کے لگ بھگ ہو گی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت ہیں۔ چہرے کے گہرے نقوش سے ارادے کی مضبوطی نمایاں ہے۔

نگہت آتی ہے عمر بائیس تئیس برس کی ہو گی۔ ذہین اور خوش مزاج لڑکی ہے۔

نگہت کمرے میں داخل ہو کر بھائی کی کرسی کے قریب رُک جاتی ہے۔ یوسف بدستور اپنے خیال میں محو ہے،

نگہت۔ میں نے کہا بھائی جان! آج کھانا نہیں کھایئے گا کیا؟ ——— پڑا پڑا ٹھنڈا ہو چکا ہے۔

سُنا نہیں بھائی جان! (یوسف کوئی جواب نہیں دیتا)

یوسف۔ ایک دم چونک کر، کھانا ——— ! ابھی کھاؤں گا

نگہت۔ مگر کب؟ امی کہہ رہی ہیں جلدی کھا لیجئے ——— ٹھنڈا تو ہو چکا ہے۔ اُٹھئے بھی نا اب ——— !

یوسف۔ ایک مرتبہ کہہ جو دیا کھاؤں گا۔ خواہ مخواہ تنگ کر رہی ہو۔

نگہت۔ (نیہ) صبح سے اخبار ہے (ہاتھ میں) آپ ہیں۔ ابھی پڑھ نہیں چکے؟

یوسف - اخبار تو پڑھ چکا ہوں -
نگہت - تو اب حفظ کرنے کا ارادہ ہے -
یوسف - ایک مسئلے پہ غور کر رہا ہوں - یہ خبر پڑھی تم نے (اخبار کی ایک خبر پہ انگلی رکھ دیتا ہے)
نگہت - کونسی خبر - (اخبار ہاتھ میں لیکر) "مشرقی پنجاب سے آئی ہوئی ایک لڑکی نے زہر کھا کر جان دے دی - کیونکہ اس کے پیٹ میں بچہ تھا" (آہ بھر کر اخبار میز پہ رکھ دیتی ہے)
یوسف - سمجھ میں نہیں آتا اس کا انجام کیا ہوگا ــــ ؟
نگہت - ایسے واقعات تو ہر روز ہوتے رہتے ہیں - چند دن کی بات ہے کہ ایک بدنصیب لڑکی نے پیٹ کا بچہ ضائع کرنے کے لئے کسی دائی سے خطرناک قسم کی دوا کھائی جس نتیجہ یہ ہوا کہ بیچاری کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا -
یوسف - آخر وقت کے اس اہم ترین اور خوفناک ترین مسئلے کا حل کیا ہے ؟
نگہت - کیا خبر قوم کے راہنماؤں نے کیا سوچا ہے ؟
یوسف - اگر جلد اس مسئلے کا حل نہ سوچا گیا اور یہ کوئی مناسب حل نہ ہوا تو ہماری سماج کی بنیادوں میں زہر پھیل جائے گا - ہمارا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور نہ جانے کتنی بیگناہ لڑکیاں ننگ و ناموس کی بھینٹ چڑھ جائیں گی ــــ ؟

(باہر سے ماں کی آواز آتی ہے)

ماں۔ یوسف!

یوسف۔ جی! (ماں آتی ہے)

ماں۔ کیا ہو رہا ہے صبح سے۔ کھانا نہیں کھایا۔ اور ہاں نگہت! مریم آئی ہے؟

نگہت۔ ادھر تو نہیں آئی

ماں۔ میرے سامنے ادھر آئی ہے۔ (یوسف سے) یوسف

یوسف۔ تو کہاں ہے مریم امی! (دروازے کی طرف دیکھ کر) شاید باہر کھڑی ہے۔

نگہت۔ مریم! (دروازے کے باہر جاتی ہے اور دوسرے لمحے میں مریم کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف لاتی ہے)

ماں۔ باہر کیوں کھڑی تھیں مریم۔

{ مریم اندر آتی ہے۔ چہرے پر پریشانی کا اظہار ہو رہا ہے۔ یوسف اسے دیکھتا ہے اور آہستہ آہستہ کمرے سے باہر جانے لگتا ہے۔ ماں چلی جاتی ہے۔ مریم بار بار دوپٹہ سینے پر پھیلا دیتی ہے۔ بار بار سمیٹنے کی کوشش کرتی ہے ـــــ دونوں لڑکیاں کھڑکی کے پاس پہنچ جاتی ہیں ـــ مریم نگہت کی خالہ زاد بہن تھی۔ عمر چھبیس سال سے زیادہ نہیں تھی }

نگہت۔ مریم! آخر تجھے ہو کیا گیا ہے۔ بھائی جان کو سلام تک نہیں کیا۔ ان کے سامنے اس طرح شرما رہی تھیں جیسے ـــــ اور تمہارا چہرہ بھی بالکل زرد

ہے۔ ایسی حالت تو اس وقت بھی نہیں تھی جب تم مشرقی پنجاب سے لائی گئی تھیں۔

مریم۔ (زار و نزار لہجے میں) میں ایک خاص مقصد کے لئے آئی ہوں!

نگہت:۔ کہو

مریم:۔ (پریشانی سے ادھر ادھر دیکھ کر) بات یہ ہے میں دلدل میں پھنس گئی ہوں،

نگہت۔ صاف صاف کہو

مریم۔ کیا تم سمجھ نہیں گئیں ــــ وہ ــــ ہو چکا ہے اب میں کدھر جاؤں؟

نگہت۔ سچ؟

مریم۔ مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟

نگہت۔ خدا ہم پر رحم کرے۔

مریم۔ ادھر سے واپس آنے کے بعد میں سمجھتی تھی کہ مجھے میری زندگی واپس مل گئی ہے۔ میں درندوں کی دنیا سے دُور ہو گئی ہوں ــــ میں اس خوفناک اور تاریک غار سے باہر آ گئی ہوں۔

نگہت۔ اور اس میں شک کیا ہے؟

مریم۔ مگر ایسا نہیں ہوا نگہت! ایسا نہیں ہو گا۔ درندوں نے مریم کو نہیں مریم کی لاش اس کے والدین کے سپرد کی ہے، مریم سے اس کا سب کچھ چھین کر ایک آبرو باختہ جسم کو اس کے گھر بھیجا ہے۔

نگہت - اس مصیبت میں تم اکیلی مبتلا نہیں ہو اور بھی ہزاروں عورتیں ہیں -

مریم - ایسی حالت میں کیونکر زندہ رہ سکتی ہوں - میری رگوں میں ایک زہریلا مادہ پھیل رہا ہے - میرے خون میں میری ذلت کے جراثیم گردش کر رہے ہیں - چند ہفتوں تک، چند ماہ تک ــــــ اس کے بعد کیا ہوگا -

{دونوں خاموش ہو جاتی ہیں - نگہت سر جھکا کر کچھ سوچنے لگتی ہے اور مریم ہاتھ کی انگلی کے ناخن سے کھڑکی کے ایک پٹ پر پڑے ہوئے بڑے سیاہ دھبے کو کھرچنے لگتی ہے}

نگہت - تو پھر تم نے کیا سوچا ہے ؟

مریم - مجھے کیا سوچنا چاہیئے -

نگہت - اس قدر مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے -

مریم - تم سمجھتی ہو میرے خاندان کا ننگ و ناموس اور سوسائٹی کا وقار اس لوتھڑے کو قبول کر لے گا جسے میں اپنا خون دے دے کر پال رہی ہوں، جو میرے جسم میں، میرے سانسوں سے میرے پیٹ میں رہ کر برابر زندگی حاصل کر رہا ہے ــــــ ؟ ؟

نگہت - اس میں تمہارا کیا گناہ ہے ؟

مریم - عورت کی مجبوری ــــــ کمزوری اس سے بڑھکر اور کیا گناہ ہو سکتا ہے

نگہت - یہ گناہ نہیں ہے -

مریم ۔ یہ تم کہہ سکتی ہو ـــــ اور تمہارے کہنے سے حقیقت نہیں بدل نہیں سکتی ـــــ نگہت ! میں ایک ہی صورت میں زندہ رہ سکتی ہوں، اور وہ صورت یہ ہے کہ کسی خبر کئے بغیر میری زندگی سے یہ بوجھ اُٹھ جائے ۔ میری پیشانی سے یہ داغ ہٹ جائے ۔ اس کے سوا میرے زندہ رہنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے !

نگہت ۔ تمہارا مطلب ہے کہ کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کیا جائے ۔

مریم ۔ مگر اس طرح کہ کسی کو اس کے متعلق معمولی سا شک بھی نہ ہو ورنہ دوا کھانے سے پیشتر کچھ اور کھا کر جان دے دوں گی ۔ یہ میرا پکا ارادہ ہے ۔

نگہت ۔ مجھے ڈر آتا ہے نہ جانے کیسی دوا ہو، نہ جانے اس کا کیا اثر ہو ۔ دوا نے اُلٹا اثر کیا تو زندگی خطرے میں پڑ جائے گی ۔ یہ معاملہ سخت نازک ہوتا ہے بہن !

مریم ۔ ویسے بھی تو میرا مستقبل، میرے خاندان کا ننگ و ناموس سخت خطرے میں ہے ۔ ذرا غور کرو بچہ ہو جانے کے بعد میری کیا حالت ہو گی ۔ خاندان کی کیا حالت ہو گی ۔ اور اس بچے کی کیا حالت ہو گی ـــــ ؟

نگہت ۔ امی سے مشورہ کر لیا جائے ۔

مریم ۔ اس سے موت بہتر ہے ۔

نگہت ۔ آخر اس میں حرج کیا ہے ؟

مریم ۔ اس صورت میں صرف موت ہی میری بدنامی پر پردہ ڈال سکتی ہے ۔

نکہت۔ خدا کے لئے اس قدر مایوسی کی باتیں چھوڑ دو۔

(مریم انتہائی یاس کے عالم میں نکہت کو دیکھنے لگتی ہے)

مریم۔ تو کچھ نہیں ہو سکتا!

نکہت۔ میری مانو! بڑوں کے مشورے کے بغیر یہ کارروائی نہیں کرنی چاہیئے۔

مریم۔ (لہجہ میں شدید اضمحلال) بڑوں کے مشورے۔

نکہت۔ یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اور ہمیں اس پر پورا پورا غور کرنا چاہیئے۔

مریم۔ میں ذلت برداشت نہیں کرسکتی موت کو خوش آمدید کہہ سکتی ہوں۔

نکہت۔ تمہیں معلوم نہیں پرسوں ہی ایک ایسا واقعہ گذرا ہے۔ ایک لڑکی نے غلط دوا کھا کر جان دے دی تھی!

مریم۔ مجھے موت منظور ہے!

نکہت۔ کچھ سہی میں تجھے موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتی۔ بہرحال ہمیں سوچنا چاہیئے بیٹھ جاؤ شربت لاؤں؟

مریم۔ پی۔ لو۔ ابھی آئی۔

(نکہت کمرے سے نکل جاتی ہے۔ مریم دروازے تک آتی ہے پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے کوچ کے قریب جاتی ہے اور اس میں گر پڑتی ہے۔ رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھتی ہے۔ ماں دروازے

میں آتی ہے۔ مریم جلدی سے سمٹ سمٹا کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور سینے پر دوپٹہ پھیلا دیتی ہے۔)

ماں۔ مریم بیٹی!

مریم۔ (بے جان سی آواز میں) جی!

ماں۔ (مریم کے قریب کرسی میں بیٹھتے ہوئے) مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ میری بیٹی! قسمت میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اب گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایک تجربکار لیڈی ڈاکٹر کو بلا بھیجا ہے — آرہی ہوگی — ہماری گلی ہی میں اس کا مکان ہے!

(مریم چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے)

ماں۔ مریم! اس طرح خاموش کیوں ہو؟

مریم۔ خالہ جان (دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپتے ہوئے زار و قطار رونے لگتی ہے)

ماں۔ مریم! مریم بیٹی!!

(مریم برابر روئے جارہی ہے)

اس طرح گھل گھل کر مر جانے سے کیا ہوگا۔ مصیبت دور ہو سکتی ہے تو اسے ضرور دور کرنا چاہیئے! — بس اب آنسو پونچھ ڈالو بیٹی!

(مریم کے چہرے سے اُن کے ہاتھ ہٹاتی ہے۔ مریم کا چہرہ

پہلے سے زیادہ زرد ہو چکا ہے)

نگہت نے اچھا کیا کہ یہ معاملہ مجھے بتا دیا ۔ ایسے نازک موقعے پر بڑی احتیاط اور تجربے کی ضرورت ہے !۔

(مریم کوئی جواب نہیں دیتی ۔ خاموشی سے خلا کو گھورتی رہتی ہے)

تم بولتی کیوں نہیں ؟

مریم ۔ کیا کہوں ؟

ماں ۔ اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ۔ !

مریم ۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں ۔

ماں ۔ ابھی ڈاکٹر آجاتی ہے ۔ خدا پر بھروسہ رکھو بیٹی !

(نگہت گلاس لیکر آتی ہے ماں دروازے کی طرف جانے لگتی ہے)

نگہت ۔ اماں ! آپ کہاں چلیں ۔

ماں ۔ تم بیٹھو مریم کے پاس ۔ نامراد شادان نہ جانے وہاں پہنچی بھی ہے یا نہیں گلی کی نکڑ میں تو ڈاکٹر کا مکان ہے ۔

(نگہت گلاس لیکر مریم کی طرف جانے لگتی ہے اور اس کے قریب پہنچ کر رک جاتی ہے)

نگہت ۔ لو مریم !

مریم۔ پیاس نہیں ہے۔

نگہت۔ کیوں پیاس نہیں ہے۔ پی لونا!

(ماں دروازے سے نکل کر پھر لوٹ آتی ہے)

ماں۔ (وہیں دروازے پر کھڑے ہو کر) پی لو مریم بیٹی!

نگہت۔ اماں! آپ ہی آکر پلائیں۔

ماں۔ توبہ! یہ لڑکی کتنا تکلف کرتی ہے۔

(ماں گلاس لیکر مریم کے ہونٹوں سے لگاتی ہے۔ مریم دو گھونٹ پی کر گلاس ایک طرف رکھ دیتی ہے، خادمہ زرینہ کمرے میں اندر جھانک کر دیکھتی ہے اور پھر جلدی سے جانے لگتی ہے)

اے زرینہ! شاداں آئی؟

زرینہ۔ (دروازے پر آکر) وہ باورچی سے باتیں کر رہی ہے۔

ماں۔ (حیرت سے) باورچی سے ___ اس کے ساتھ کوئی نہیں آیا۔

زرینہ۔ نہیں۔

نگہت۔ اماں! جاکر دیکھئے تو

(ماں کمرے سے باہر نکل جاتی ہے)

مریم۔ نگہت! تو نے وہی بات کی۔

نگہت ۔ مریم! بتا دیں کیا کر سکتی تھی ۔۔ ؟ کس سے کہتی ۔۔ اور کیا کہتی ۔ خدا جانتا ہے امّی کو تمہارا بڑا دکھ ہے ۔

مریم ۔ سب کو خبر ہو گئی ۔۔ سب کو معلوم ہو گیا ۔ میں کہیں کی نہیں رہی ۔۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی!

نگہت ۔ دیوانوں کی سی باتیں کر رہی ہو ۔۔ امّی خیر ہے کیا

مریم ۔ ، اور بھائی جان ۔

نگہت ۔ کیا خبر شاداں اور ان کے درمیاں کیا باتیں ہوئیں ، خواہ مخواہ سمجھ لیا کہ انھوں نے شاداں سے اس معاملے کے بارے میں گفتگو کی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لیڈی ڈاکٹر کو بلانے گئی تھی ، تاہم دنیا میں ہزاروں باتیں ہیں ۔ خیر ابھی آ جائے گی وہ

مریم ۔ کون ۔۔ ؟

نگہت ۔ لیڈی ڈاکٹر (یوسف دروازے میں ہوتا ہے)

یوسف ۔ مجھے اندر آنے کی اجازت ہے

(مریم دوسری طرف منہ پھیر لیتی ہے)

نگہت ۔ کیا ہے بھائی جان!

(یوسف اندر آتا ہے اور ان کے قریب پہنچ جاتا ہے)

نگہت ۔ میرا خیال ہے اس وقت ۔۔ (یوسف کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہے)

یوسف - میں مریم سے کچھ کہنے آیا ہوں -

نگہت - اس وقت ـــــ ؟

یوسف - میں جو کچھ کہنا چاہوں اس کے لئے یہ موزوں ترین موقعہ ہے -

نگہت - آپ دیکھ رہے ہیں بہن مریم بڑی پریشان ہیں ـــــ باتوں سے ان کی مصیبت اور خراب ہو جائے گی -

یوسف - تاہم مجھے جو کچھ کہنا ہے ضرور کہوں گا (مریم سے مخاطب ہو کر) مریم! گھر میں جس کارروائی کا ارادہ کیا جا رہا ہے - وہ مجھ سے پوشیدہ نہیں رہی تمہارے مسئلے اور تمہارے ساتھ ہزاروں عورتوں کے مسئلے کا حل ڈاکٹروں کے پاس نہیں اس چیز کے پاس ہے جسے انسانیت کہتے ہیں - میری آرزو ہے کہ تم مجھے اپنا شریک حیات بنا لو ـــــ ہم دونوں آخری سانس تک ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہیں گے - مریم! کیا تم میری آرزو پوری نہیں کرو گے - ؟

(مریم چپ چاپ خلا کو گھورتی رہتی ہے جیسے یوسف کے الفاظ کو سمجھ نہیں سکی، نگہت کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اور وہ بے اختیار ہو کر مریم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے)

نگہت - سچ کہہ رہے ہیں آپ بھائی جان!

یوسف - ہاں میں صدق دلی سے اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر اپنی رفیقۂ حیات کا ساتھ دوں گا - اور وہ بچہ جس نے ابھی تک سورج کی روشنی بھی نہیں دیکھی میرا اپنا بچہ بن کر میری گود میں کھیلے گا -

(مریم اس طرح چونک پڑتی ہے جیسے کوئی خواب دیکھتے ہوئے ابھی ابھی اس کی آنکھ کھل گئی ہو اور وہ پہلی مرتبہ یوسف کی طرف دیکھتی ہے جس کے چہرے پر سنجیدگی برس رہی ہے اور ارادے کی مضبوطی ظاہر ہے)

مریم - آپ — آپ نے کچھ سوچا ہے — سماج —

یوسف - (اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے مسکرا کر) ایسے موقع پر مجھے سماج خاندانی ننگ و ناموس — اور اس قسم کے دوسرے لفظوں سے شدید نفرت ہے - یہ الفاظ ہماری اپنی کمزوری کے مختلف پہلو ہیں — مجھے مریم سے صرف یہ پوچھنا ہے کیا وہ مجھے مایوس تو نہیں کرے گی -؟

نگہت - کہو بھی نا بھابی کچھ اپنی زبان سے -

مریم - میں کیا کہوں — پھر بھی (ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے) میرا دل ڈوب رہا ہے -

یوسف - خدا کے لئے اپنے اندر ہمت اور جرأت پیدا کیجئے، ہم کو ایک نئی سماج کی بنیاد رکھنا ہے، ایک نئی دنیا تعمیر کرنا ہے - انسانیت کے گرمے

پرچم کو پھر لیتریوں پر لہراتا ہے — یہاں کمزوریوں سے کام نہیں چلیگا!

(ماں آتی ہے)

ماں - یوسف! تو یہاں آ پہنچا ہے - شاداں کو جانے کیوں نہیں دیا -

نگہت - اماں اب لیڈی ڈاکٹر کی قطعاً ضرورت نہیں ہے — بھائی جان نے اس مسئلے کو حل کر دیا ہے -

ماں - (گھبراکر) حل کر دیا ہے ؟ — کس طرح

نگہت - مریم (مریم کی طرف دیکھ کر) اب یہیں رہے گی!

ماں - (زیادہ گھبراکر) یہ مریم کا اپنا گھر ہے

نگہت - امی! مریم میری بھابی بن کر رہے گی -

(نگہت مریم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے مریم کی پیشانی پسینے سے تر بتر ہے)

یوسف - امی! اس مسئلے کا اس کے سوا اور کوئی حل نہیں ہے — ارادے میں مضبوطی، کیوں امی جان -

ماں - (گھبراہٹ میں) موزوں الفاظ نہیں ملتے، مگر — بیٹا! — مگر

شاہکار کا انقلاب نمبر

اردو صحافت اور اردو ادب میں انقلاب کا لفظ ایک اجتماعی ہیجان کے مفہوم میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے سیاسی تحریکات کی بحرانی کیفیات کے مواقع پر "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی ہے لیکن ابھی تک اس عمرانی اصطلاح کے مختلف پہلوؤں پر اچھی طرح روشنی نہیں ڈالی گئی ہماری اجتماعی زندگی کے موجودہ ہیجانی اور عبوری دور میں اشد ضرورت ہے کہ لفظ انقلاب کی مکمل تشریح کر کے اسکے متعلق ہر قسم کے ابہام کو دور کیا جائے، اس مقصد کے پیش نظر شاہکار کے ادارے نے ارادہ کیا ہے کہ دسمبر ۱۹۴۸ء میں شاہکار کا ایک "انقلاب نمبر" شائع کیا جائے اور اردو زبان کے ممتاز ادیبوں کو دعوت دی جائے کہ وہ لفظ "انقلاب" کے مختلف عنوانات کے تحت روشنی ڈالیں تاکہ اس اصطلاح کے متعلق کسی قسم کا ابہام اور الجھاؤ باقی نہ رہے اس وقت تک جو عنوانات ہمارے پیش نظر ہیں وہ درج ذیل ہیں :-

۱- انسان اور انقلاب
۲- دنیائے قدیم کے نقطۂ نظر سے انقلاب
۳- مذاہب اور انقلاب
۴- انقلاب فرانس
۵- انقلابِ روس
۶- انقلاب، مارکس کی نظر میں
۷- صحافت اور انقلاب
۸- ادب اور انقلاب
۹- فرانس کے انقلابی ادیب
۱۰- روس کے انقلابی ادیب
۱۱- انقلاب کا اثر زبان پر
۱۲- دنیا کی انقلابی عورتیں

نوٹ:- امید ہے وہ بالغ نظر ادباء جو اس "انقلاب نمبر" کی اہمیت کو سمجھتے ہیں وہ ہمیں مطلع فرمائیں گے کہ وہ کس مضمون پر اپنا مقالہ ارسال فرمائینگے — اعلیٰ مضامین، بلند پایہ افسانوں اور اچھی نظموں کو نمایاں جگہ دی جائے گی۔

مدیر

بُدھ کے بعد

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر قریشی

یہ آج سے بہت پہلے کی بات ہے، آج ہی سے نہیں ۱۵ راگست سے بھی بہت پہلے کی بات ــــــ ہاں پندرہ اگست کی تخصیص ہماری ہر بات میں شامل ہے، اس سے پہلے اور اس کے بعد ہماری سیاسی سماجی اور معاشرتی زندگی دو مختلف حصوں میں بٹ گئی ــــ یوں بھی دنیا ہمیشہ بٹی رہی، وقتاً فوقتاً لوگ آتے رہے اور اسے ایک بنانے کی کوشش کرتے رہے، انسانیت ہمیشہ منقسم رہی کچھ انسان پیدا ہوئے اور انہیں آپس میں ملانے کی کوشش میں ختم ہو گئے، یہ بات ابھی تک جاری ہے، نسل، رنگ، قوم اور مذہب کے امتیازات، انسانیت کو تقسیم کرتی ہوئی دیواریں ہیں اور لوگ ان سے سر پھوڑ رہے ہیں ــــ

لیکن میں ایک بات کر رہا تھا بلکہ ایک بات کہنا چاہتا تھا اور وہ بات اس نئی تقسیم سے بہت پہلے سے شروع ہوتی ہے۔

اس وقت سے جب ... یہ دنیا ایک اجنبی سی دنیا تھی جسے خود کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا، معصوم، بے خبر اور بے نیاز، ایک الہڑ دوشیزہ کی طرح، ایک انجان سی دھند میں لپٹی ہوئی،

نرم و نازک پودے اس میں سوتے ہوئے جاگتے، سر اٹھاتے اور نسیم سحری کے جھونکوں میں مچلتے رقص کرتے ــــ وہ دیکھتے آتے تھے کہ سورج نکلتا، ان کے رخساروں کو تمتماتا ہوا غروب ہو جاتا، چاند کی نرم اور ٹھنڈی کرنیں اسے پیار کرتیں اور وقت گزرتا رہا ــــ دن ہفتے مہینے ــــ مہینے سالوں اور صدیوں میں تبدیل ہوتے گئے انہیں وقت کا احساس تو تھا ہی نہیں، وقت ایک مسلسل زنجیر ہے، زندگیاں اس کی مختلف کڑیاں ہیں۔

پودے جاگتے رہے، پھول کھلتے رہے، چشمے بہتے رہے اور وقت گزرتا رہا۔ زمین کو اپنے خزانوں کا علم نہ تھا، پہاڑوں کی غاروں کے قیمتی پتھروں سے اگر وہ بےخبر تھی تو سمندر کے سینے میں پنہاں موتیوں سے وہ بے نیاز تھی ــــ کھیلتے کودتے، دندنانے راکششوں کا گزر ہوا تو ان کی طبیعت مچل گئی۔

ایک نے کہا، "یہ پھول میرے ہیں"

دوسرے نے کہا "یہ درخت میرے ہیں"

بہت سی آوازیں آئیں "یہ پھل میرے ہیں" "یہ جگہ میری ہے"۔ یہ ــــ ــــ اور سب نے اپنی اپنی چیزیں سنبھال لیں، صلح صفائی سے نہیں مجبوراً، اور کبھی کبھی قبضے کی ہوس انہیں پھر الجھا دیتی۔ آسمان پر دیوتا مدھیرا پیتے رہے، قہقہے لگاتے رہے اور اپسراؤں کے رقص میں مگن رہے،

راکشش زمین پر حکومت کرتے رہے، لڑتے جھگڑتے خون بہاتے ہوئے ــــ

پونے ابدی نیند سو گئے، پھول مرجھا گئے، زمین اداس ہو گئی، وہ اپنے پر یہ ظلم برداشت نہ کر سکتی تھی، زمین یہ سب برداشت نہ کر سکی، وہ چیخی چلائی ——— !

دیوتاؤں کے قہقہے خاموش ہو گئے، اپسراؤں کا رقص تھم گیا، مدھیراؤں کا نشہ ختم ہو گیا۔

دیوتا زمین پر اترے، زمین جگمگا اٹھی، راکششوں کے دل دہل گئے ——— !

اس وقت مہابھارت یدھ ہوا، ایک طرف دیوتاؤں کی مدد تھی، دوسری طرف راکششوں کی، خون بہا، جوان مرے، مگر آخر دیوتاؤں کو فتح نصیب ہوئی،

مگر یہ ابدی فتح نہ تھی، راکشش زندہ تھے اور سوچ میں تھے،

دیوتا بھی زمین پر اداس تھے، یہاں پھول تھے، پھل تھے، شبنم تھی، شہد تھا، مگر وہ آسمان کی بلندیاں جو دیوتاؤں کا مسکن تھا انہیں یہاں میسر نہ تھیں، انہیں واپس جانا تھا، پوتر دھیرا تھی، سندر اپسرائیں تھیں، اور ان کا منہر رقص تھا ———

انھوں نے دنیا سے جانے سے پہلے چاہا کہ یہاں سے کچھ آکاش کی اپسراؤں کے لئے لے جائیں، دیوتاؤں کی نظریں بڑی تیز تھیں اگر پہاڑوں کے قیمتی پتھر ان کی نظروں میں تھے تو سمندر کی اتھاہ گہرائی میں چھپی آتی منہر چیزیں بھی ان سے چھپی نہ تھیں ———

سمندر کی گہرائیوں کی چیزوں کے لئے انھوں نے سمندر بلونا چاہا، دیوتاؤں اور راکششوں نے مل کر سمندر بلونا شروع کیا، زمین نے اطمینان کا سانس لیا۔

سونا، چاندی، ہیرے، موتی ——— چیزیں نکلتی رہیں اور وہ آپس میں بانٹتے رہے راکشش اور دیوتاؤں کا اشتراک زمین کے لئے خوشگوار تو نہ تھا مگر پھر بھی وہ دم بخود

دیکھتی رہی۔

ایک دیوی نکلی جس کے رُوپ سے سب کی آنکھیں چندھیا گئیں، دیوتاؤں کو اپسرائیں بھول گئیں اور راکششوں کو اپسرائیں یاد آنے لگیں، ان کی مکروہ بڑی بڑی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، دیوی کا سیاہ زلفوں میں چھپا ہوا حسین چہرہ چاندی کی سی چمک دمک رکھتا تھا، اس کا شریر گویا ان سب کی خواہشوں کی انتہا نے ایک رُوپ دھار لیا تھا۔

— اس کے فیصلے سے پہلے، کہ اسی میں انھوں نے مصلحت سمجھی، انھوں نے سمندر پھر سے بلونا شروع کیا،

امرت نکلا ——!

دیوی دیکھتی رہی، راکشش اس پہ ٹوٹ پڑے، ایک حصہ لیا اور اسے چاٹنے لگے، دیوتا بیٹھ کر اسے پینے لگے، سب نے اپنا اپنا جی بھر لیا،

دیوی نے راکششوں اور دیوتاؤں دونوں کی ہوس دیکھی اور مسکراتی رہی مگر اسکا دل دہل رہا تھا۔

پھر اور چیزیں نکلتی رہیں ——!

پھر ایک زہر نکلا —— راکششوں کے چہروں پہ نحوست برسنے لگی، دیوتا خوفزدہ ہو گئے، زہر زمین پہ پھیلنے لگا، دیوی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

زہر بڑھتا جا رہا تھا، نرم پودوں اور خوبصورت پھولوں کو پامال کرتا ہوا بڑھ رہا تھا

—— دیوتا سوچ رہے تھے،

منش پکار رہے تھے، سامنتی راجاؤں اور پروہتوں کے ظلم بڑھتے جا رہے تھے

راج کی حدیں وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھیں۔ راجہ کا ظلم اور پرجا کی مصیبت بڑھتی جا رہی تھی، جنتا مصیبت میں تھی ——

رات کے سمے ایک انسان سوچتا سوچتا اُٹھا۔ اس نے کچھ فیصلہ کر لیا تھا وہ اس سے پہلے بھی سوچتا رہا تھا، اس کا نشچے تھا کہ وہ دنیا کے پاپوں کا کوئی علاج ڈھونڈے گا، جنتا کی بھلائی کا کوئی جتن کرے گا ——

امرت اس کے سامنے تھا، راج پاٹ، سندر بیوی، بھولا بچہ۔ وہ سب کو تیاگ گیا۔

گوتم رات کی تاریکی میں باپ کا راج محل اور اسکا سب آرام چھوڑ رہا تھا، جگہ جگہ کی ٹھوکروں اور انتھک ریاضت کے لئے ——

راہ میں بارہا پرانی یادوں نے اسے روکنا چاہا بارہا بچے کی معصوم مسکراہٹ نے اسکے پاؤں پکڑ لئے، بارہا یشودھرا کی سندرتا نے اپنی گداز باہیں اس کے گلے میں حائل کر دیں مگر اس کے قدم نہ ڈگمگائے، وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا، اس نے زہر کا گھونٹ پینا گوارا کیا۔ وہ بڑھا اور اس نے لب زہر کے پیالے سے لگا دئے، زہر کا بڑھنا رُک گیا، زمین نے اطمینان کا سانس لیا، انسانوں نے اپنے اندر ایک مہاتما دیکھا اور اسے دیوتا مان کر پرنام کیا —— صدیاں بیت گئیں اور زمین گوتم بدھ کو دعائیں دیتی رہی ——

دیوتا اطمینان سے بیٹھے رہے۔ مگر راکشش امرت پی کر اودھم مچاتے رہے۔ کالنگا کی زمین سُرخ ہو گئی، زہر پھر بڑھنے لگا زمین نے پھر گوتم کو پکارا ——

اشوک نے اپنے لب زہر کے پیالے کیساتھ لگا دئیے، پودے پھر بڑھنے لگے

پھولوں نے پھر آنکھیں کھولیں، غنچوں نے پھر مسکرانا شروع کر دیا، ـــــ ندیوں اور چشموں نے پھر سے گیت الاپنے شروع کئے، شراب و شعر کے نغمات محبت و انسانیت کے گیت ابدی و ازلی مسرت کے راگ!

بابر نے ہمایوں کے ہاتھوں سے چھین کر زہر کا پیالہ خود پی لیا ـــــ

ہمایوں نے سلطنت سے برادرانہ محبت کو ترجیح دی اکبر نے انسانوں کے درمیان کی دیواروں کو گرانا چاہا، اس نے امتیازات کو دُور کرنا چاہا ـــــ

جہانگیر کے عدل و انصاف نے کوئی امتیاز روا نہ رکھا۔ ایک جلیل القدر ملکہ نے اپنے تاج سے کہا شہنشاہ میں چاہتی ہو ہماری محبت امر ہو جائے، دیوتاؤں کے اس عہد کی یادگار لافانی محبت کے عکس میں دنیا کو ملتی رہے ـــــ"

شہنشاہ کی آنکھوں میں آنسو تھے، قوی شہنشاہ محبت کی بارگاہ میں کتنا نربل تھا،

"ہاں ارجمند بانو، ہماری محبت اس عہد کی سب سے بڑی یادگار ہے اور اس محبت کو دنیا یاد رکھے گی، دنیا کو اسے یاد رکھنا ہوگا ـــــ"

اور اس نے اپنے آنسوؤں کے درپن سے ملکہ کو دیکھا اس کے تخیئل میں "تاج" تھا ـــ

اور معماروں نے اس کے تخیئل کو پتھروں میں ڈھال دیا، ـــــ

سمندر ابھی تک پیچ و تاب میں تھا، دیوتا امرت کے پیالے تھامے ابھی تک مست تھے، راکشش زمین کے زیادہ سے زیادہ حصے پر تسلط کی فکر میں تھے ـــــ

انھوں نے تاج دیکھا، ان کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ لپک چمک اٹھی، انہوں نے

تاج کو سلام کیا اور اس کے مالکوں سے راہ و رسم بڑھائی ـــــ

سمندر کی دیوی چونک اٹھی اس کا چہرہ پھر زرد پڑ گیا، اس کا شریر نڈھال ہو گیا ـــ

ـــ راکشش بڑھتے گئے، زمین چیختی رہی چلاتی رہی مگر دیوتا امرت کے نشے میں تھے۔

لوگ مرتے رہے، لال قلعے کے دیس کی دھرتی لال ہو گئی،

منش راکششوں سے ٹکرائے مگر مات کھائی، دیوی نراش ہو گئی، شاید اسے راکششوں کی میراث بننا ہوگا، دیوتا امرت پاکر اس سے بھی بے خبر ہو رہے تھے ـــــــــ

انسان کے زخم مندمل ہو گئے، ان کی آنکھوں میں سمندر کے کنارے کی دیوی کی نراش نظریں تھیں، اس کے جسم کی پکار انہیں اکسا رہی تھی زمین کے بٹوارے کے لئے راکشش لڑ رہے تھے، انھوں نے ۵۷ء کے بعد ایک بار پھر ان راکششوں سے ٹکر لی۔

آگ اور فولاد کی ورشا ہوئی اور زمین پر انسانی لہو کے چھینٹے گرتے رہے اور اسے سُرخ کرتے رہے ـــ

راکشش اور منش دونوں نڈھال ہو گئے، دیوتا مست تھے امرت کے پیالے کیلئے راکششوں نے زہر کو غیر مرئی لیکن پھر بھی جانے بوجھے طور پر زمین کے جسم میں پھیلانا شروع کیا ـــــ زہر ریشے ریشے میں سرایت کر رہا تھا مگر انسان کمزور تھے۔

دیوتاؤں نے وقت سے فائدہ اُٹھانا چاہا، پیشتر اس کے راکشش پھر سے طاقتور ہو کر منش کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں یا منش بلوان ہو کر راکششوں کو ختم کر دیں اور دیوتاؤں تک کو بھول جائیں انہوں نے زمین کی فریادوں پہ کان دھرنا شروع کر دیا۔

زمین نہ دیوتا چاہتی تھی نہ راکشش اور بل کھائے ہوئے سمندر سے نکلی ہوئی دیوی کو نہ دیوتاؤں کا ساتھ پسند تھا اور نہ ہی راکششوں کا، دونوں کی ہوس کا اندازہ وہ خوب کر چکی تھی، وہ سب امرت کے بھوکے تھے، سب کی نظریں دیوی کے حسن پہ تھیں مگر وہ اس کی فریاد سے اپنا مقصد زیادہ عزیز رکھتے تھے ——— اگر منش جس کی دلیرانہ جرأتوں پہ وہ فریفتہ تھی، کو ان کی مدد کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ ان سے نفرت کرتی مگر راکششوں کو ختم کرنے کے لئے انہیں دیوتاؤں کی مدد کی ضرورت تھی، ——— دیوی ایک سمجھوتے کی خواہاں تھی، دیوتا بھی کیونکہ آسمانوں کی کشش کو دیوتا دیر نہ روک سکتے تھے، اور شاید راکشش بھی، ہاں، راکشش بھی کیونکہ منشوں کے بڑھتے ہوئے بل کا اندازہ وہ دو بار کر چکے تھے، تیسری جنگ میں وہ اپنا ناش ہوتا دیکھ رہے تھے ———

دیوتاؤں نے ایک دن اپنے جانے کا ارادہ ظاہر کر دیا، راکششوں کے دل اس دن خوشی سے رقص کرنے لگے۔ زہر پھیل رہا تھا، رگ رگ میں ریشے ریشے میں، زیادہ ——— اور زیادہ وہ اسے پھیلا رہے تھے،

دیوتا جا رہے تھے، انہیں شاید اس کی پرواہ بھی نہ تھی —— زہر بہتا اور لاوے کی مانند، انسانیت، اخوت اور محبت کے نرم پودوں کو روندتا ہوا انسانوں میں دیواریں بن بن کر حائل ہوتا رہا،

نسل کی، رنگ، کی، زبان کی دیواریں! انسان بٹتے گئے ——

دیوتاؤں نے رخت سفر باندھا، آسمانوں پر اپسرائیں ان کے بغیر اداس تھیں، ان کی سندرتا ان کا انتظار کر رہی تھی، پڑی پڑی مدھیرا کا نشہ ان کی غیر حاضری میں زیادہ ہوتا جا رہا تھا، انہیں مدھیرا بلا رہی تھی، اپسرائیں اور رقص!

دیوتا چلے گئے —— سمندر سے نکلی ہوئی دیوی کے چہرے پہ خوشگوار اور حسین مسکراہٹ پھیل گئی،

سنسار میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا جیسے کچھ اس کا اپنا حصہ اس میں سے کاٹ لیا گیا تھا

زہر اور دیواریں حائل کرتا گیا، وطن کی اور قوم کی دیواریں ہی کافی نہ سمجھی گئیں، عقیدے کی، خیالات کی دیواریں انسانوں کو بانٹنے لگیں۔

دیواروں کی زیادتی سے انسانوں کا دم گھٹنے لگا، معلوم ہوتا تھا زہر جسم کے آخری حصہ تک پہنچ جائے گا اور دھرتی کا سارے کا سارا شریر بس کا پیالہ بن جائے گا اور اس وش کنیا کا حال کیا ہو گا؟

اس کے چاہنے والوں کا انت کیا ہو گا؟ یہ خیال سوچنے والے

پرشوں کو ڈرا دیتا، ان کے ہرد سے ڈول جاتے، ان کی نبضیں ڈوبنے لگتیں ——

وہ اس کا توڑ سوچ رہے تھے، سر جوڑ کر وہ اس کا توڑ سوچتے مگر زہر اپنا کام کر رہا تھا ——

کلکتہ، نواکھالی!

بہار —— !

دھرتی کا چہرہ داغدار ہوتا رہا —— اور سمندر بلونے سے نکلی ہوئی آزادی کی دیوی جانگداز اداسی میں کھو گئی، اسے اپنا انجام نظر آرہا تھا، وہ ابھی تک سمندر کے نزدیک کھڑی تھی، شاید راکشش پھر جیت جائیں، شاید اسے پھر سمندر کی گود میں جانا ہو ——

یہ سوچ اسے آزردہ، اور آزردہ کرتی رہی،

مغربی پنجاب —— ! راولپنڈی، لاہور

امرتسر!

دھرتی کا سارا شریر لہولہان ہو رہا تھا، لہو کے پتھیرے جم گئے تھے، اس کا جسم متعفن ہو رہا تھا،

مشرقی پنجاب!

دہلی —— !

یہاں پرشوں کی سوچ بیکار نظر آتی تھی، زہر اپنا کام کر رہا تھا سوچ بیکار تھی،

بلیدان! ایک انسان نے سوچا —— وہ اس سے پہلے بھی سوچتا رہا، وہ دنیا کے پاپوں کا علاج ڈھونڈنا چاہتا تھا، جنتا کی بھلائی کا کوئی جتن کرنا چاہتا تھا،

وہ بڑھا اور اس نے اپنا منہ زہر کے پیالے کو لگا دیا، زہر واپس ہٹ رہا تھا، اس کی جگہ امرت، محبت و اخوت کا پیغام بڑھ رہا تھا ——

—— اور لال قلعے کے دیس کی لال دھرتی سے پھر محبت و اخوت، پیار و سلوک کے نرم پودے نکلنے شروع ہو رہے تھے، دیوی کا چہرہ تمتما رہا تھا ——

مگر راکشش ابھی زندہ تھے، انہیں دھرتی پہ اپنا قبضہ ختم ہوتا نظر آتا تھا۔

ایک راکشش بڑھا،

لال قلعے کے دیس کی دھرتی پہ ایک راکشش بڑھا،

ایک گولی،

دو گولی،

—— تین، چار!

ایک نحیف و نزار انسان کا کمزور جسم جو محبت، اخوت، انسانیت اور مساوات کا امرت پھیلا رہا تھا زمین پر گرا دیا گیا،

رام!

رام!!

لہو کی ایک دھارا بہہ نکلی،

گاندھی ختم ہو گیا،

اس کے لہو نے زہر کی بنی ہوئی دیواروں پر ایک کاری وار کیا، وہ لڑکھڑائیں اور گر گئیں،

انسانوں نے اپنے اندر ایک مہاتما کو دیکھا اور اسے جھک کر پرنام کیا——

حادثے

احمد کیف

صفیہ باجی پائیں باغ کی جانب کھلتی ہوئی کھڑکی سے باہر کہر آلود فضا میں تک رہی تھی۔ جیسے وہ اپنے ذہنی تصورات کی جلا سے ماضی کے تاریک سایوں میں ڈوبی ہوئی زندگی کے چند محبوب اوراق کو پھر سے روشن کرنا چاہتی ہو۔ وہ کتنی غمگین اور اداس تھیں کیسی گہری سوچ میں مستغرق۔ ان کی غیر مطمئن اور حساس نگاہیں ہر وقت کسی کی تلاش کرتی رہتی تھیں۔ ان کے ارد گرد خوشیاں تھیں مسرتیں تھیں، زندگی تھرکتی پھرتی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو ہمیشہ تنہا محسوس کرتیں اور یہ احساسِ تنہائی روز بروز ان کی روح کی گہرائیوں میں اترتا جاتا تھا۔

وہ خزاں کی ایک اداس اور پھیکی سی صبح تھی۔ باہر دھند کے مرغولے سمندری جھاگ کے بڑے بڑے تودوں کی طرح تیرتے پھرتے تھے۔ درختوں اور پھولوں کے اوس میں نہائے ہوئے زرد زرد پتے خاموش ٹہنیوں پہ جھکے ہوئے تھے۔ کتنے زرد تھے وہ۔ جیسے قریب سے جھانکتی ہوئی موت کے خوف سے ان کا رنگ پیلا پڑ گیا ہو، ان خاکستری پتوں میں اب کچھ بھی تو جاذبیت اور رنگینی نہ تھی۔ جیسے زندگی کی روانی میں تھم گئی ہو اور ماحول بھی تو بالکل سنسان اور خاموش تھا شاید وہ اپنی ابدی بھاگ دوڑ اور مسلسل شور و شر سے گھبرا کر چند گھڑیوں کے لئے سو

چمکا تھا۔ صرف کبھی کبھی دھند کے کسی سفید گالے کی پرلی طرف اڑتے ہوئے کوؤں کی نحیف آوازیں سنائی دیتیں، کوؤں کے یہ غول جو دور آسمان میں بھٹکتے ہوئے سیاہ دھبوں کی طرح معلوم دیتے تھے دانے دنکے کی تلاش میں بے سود مصروف رہتے تھے اور بعض اوقات وہ بھوک کی شدت سے چلا کر کائیں کائیں کرتے جھپٹ کر نزدیک کے درختوں پر آ بیٹھتے اور اپنی بڑی بڑی بھوکی چونچوں سے ٹہنیوں کو ٹھونگنے لگتے۔

ایک ایسی ہی صبح کو دھند کے تاریک مرغولوں نے صفیہ باجی کی مسرور زندگی کو ہمیشہ کے لئے محیط کر لیا۔ اس روز وہ بیحد خوش تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک دلکش خمار تھا۔ ایک نرالا فسوں تھا۔ ان کے ملکوتی حسن میں ایک نئی ملاحت اور کشش تھی ان کے ریشمی آنچل سے پھسلتی ہوئی دو معطر لٹیں چاندی سی پیشانی پر بار بار پریشان ہو جاتیں اور ہنستے وقت گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے پڑ جاتے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی وہ کتنی خوش تھیں اس روز جیسے خود مسرت ان کی خوبصورتی پر اتراتی پھرتی ہوں۔

اس روز انھوں نے ہلکا گلابی سوٹ پہنا جو جاوید بھائی کو بہت پسند تھا اور اکثر کہا کرتے "صفیہ تم یہ سوٹ پہن کر سچ مچ گلاب کی کلی بن جاتی ہو۔ جاوید بھائی صفیہ باجی کے منگیتر تھے اور ہفتہ عشرہ میں وہ مسز جاوید بننے والی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اکثر اکٹھے سیر کو جاتے، اکٹھے سینما دیکھتے۔ ان کے مشاغل ایک تھے۔ خیالات ایک تھے۔ ان کی زندگیوں میں ایک ہی روح تھی، وہ ہمیشہ

مسکراتے رہتے کبھی کسی کے منہ سے شکایت کا ایک لفظ تک نہ نکلا۔ وہ کتنا حسین اور پیارا جوڑا تھا۔

ان دنوں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ کے شعلے ایک بار بھڑک کر ذرا دھیمے پڑ گئے تھے شاید فریقین اس مختصر سے وقفہ میں اپنے تھکے ہوئے ہاتھوں اور شکست خوردہ قوتوں کو مزید تقویت پہنچانے کے لئے اپنے بھائی بندوں سے تازہ کمک اکٹھی کر رہے تھے۔ شاید وہ اپنی بہیمی قوتوں [illegible] گھمسان کی ٹکر لینے کے لئے دوبارہ تیار کر رہے تھے۔ کئی دنوں کے بعد اب پھر دو چار چار آدمیوں کی ٹولیاں سڑک پر سرگوشیاں کرتی ہوئی گذرنے لگیں۔ اُترے سے ہوئے زرد زرد چہرے ایک دوسرے سے سرگوشی میں کچھ کہتے اور ایک پھیکی سی مسکراہٹ سکڑے ہوئے ہونٹوں کے گرد پھیل جاتی۔ اور جب کبھی کسی ملٹری ٹرک کو نکلتے ہوئے نظر پڑ جاتی تو وہ زرد زرد چہرے اور بھی سہم جاتے اور سکڑے ہوئے ہونٹوں پر پپڑیاں اور بھی نمودار ہو جاتیں۔ انسانی ڈھانچ میں مسرت ڈھونڈنے والی زندگی اب اس کمزور ڈھانچ کے بہیمانہ افعال سے ڈری ہوئی اس کے وحشیانہ حرکات سے سہمی ہوئی اب پھر کھلی ہوا میں رینگنے لگی تھی۔

اس روز دھند کے بڑے بڑے گالے فضا کے دوش پر سوار تھے۔ جاوید بھائی سیر کے بڑے شوقین تھے کئی روز کی مقید زندگی سے تنگ آ کر وہ صبح صبح باہر نکل گئے۔ سڑکوں کی کھلی فضا میں پہنچ کر ان کے جذبات نے اس مانوس ماحول میں ایک جھرجھری سی لی اور ان کا دل چاہا کہ آج دور تک سیر کریں۔

دھند کے مرغولے اور بھی گہرے اور تاریک ہوتے جا رہے تھے۔ کافی دیر تک جاوید بھائی واپس نہ آئے تو ہمیں سخت پریشانی ہونے لگی۔ تھوڑی دیر اور انتظار کیا پھر تو خوف و ہراس سے سب سہم گئے۔ صفیہ باجی کا رنگ کسی نامعلوم خوف سے زرد پڑتا جا رہا تھا۔ بالآخر میں دو نوکروں کو ساتھ لیکر ان کی تلاش میں نکلا۔ ہم سہمے سہمے بے سود ادھر ادھر گھومتے رہے۔ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ وہ اکثر شملہ ہل کی طرف جایا کرتے تھے۔ ہم تیز تیز قدموں سے اس طرف چل دیئے۔ کتنی خاموشی تھی اس طرف جیسے ہر چیز اس وحشت و بربریت سے ڈر کر ساکت و جامد ہو گئی ہو۔ جب ہم پہاڑی کے غربی کونے سے ہو کر بکائن کے پرانے درخت کے پاس پہنچے تو ہمارے دل دھک سے رہ گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے سفید سفید عجیب و غریب حلقے ناچنے لگے۔ زمین و آسمان گھوم گھوم گھوم کر اب شدت سے قلابازیاں کھانے لگے جیسے وہ ابھی ایک منٹ میں کھنڈرات کا ڈھیر بن جائیں گے۔ میرا دل چاہا کہ کپڑے پھاڑ کر زور زور سے چیخوں اور اس وحشی دنیا سے دور۔ انسانی سایوں کی زد سے پرے افق کے اس پار بھاگ جاؤں۔ جاوید بھائی بکائن کے اس کہنہ درخت کے نیچے ابدی نیند سو رہے تھے۔ کتنی گہری نیند تھی وہ اب ان کے ہم جنسوں کی وحشی اور انسانیت سوز حرکات بھی اس گہرے سکوت کو نہ توڑ سکتی تھیں۔ ان کا زخم خوردہ خون آلود جسم اب سکون و راحت کی اتھاہ گہرائیوں میں مدفون پڑا تھا ——— ان کے کشادہ سینے پر ایک گہرے گھاؤ سے خون رس رس کر بائیں کنپٹی کے پاس ایک ننھے سے گڑھے میں جمع ہو رہا تھا۔ دائیں بازو سے لٹکتے ہوئے

لوتھڑے پر خون منجمد ہو کر سیاہ ہو چکا تھا۔ گردن کے ایک طرف کے پٹھے کٹ کر انتہائی کرب میں تڑپ تڑپ کر ٹھوڑی کے پاس سکڑ کر ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ ان کا سر مرجھائے ہوئے پھول کی طرح بل کھا کر کندھے سے جا لگا تھا۔ ان کی بے نور پتلیوں میں کتنی بیچارگی اور حسرت تھی ان کی کافوری پیشانی پر حزن و ملال کے کچھ آثار ان کے دہشت زدہ لمحات کا انکشاف کر رہے تھے ان کی لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے پیچھے حسرت و یاس کے گہرے حلقے کھنچ گئے تھے...... اور جب ہم ان کو اٹھا کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گھر پہنچے تو ایک وحشت تھی جو ہر شخص پر سوار تھی۔ ایک کرب انگیز درد سے ہر فرد کراہ رہا تھا۔ اترے ہوئے زرد زرد چہرے نہایت پریشانی سے خون رستے ہوئے زخموں پر نظر جمائے ہوئے تھے صفیہ باجی کا رنگ فق تھا جیسے پتھر کی مورت کھڑی ہو وہ ٹکٹکی باندھے ان زخموں کو سکڑے ہوئے سرخ سرخ عنابی ہونٹوں کو از حد کرب سے تک رہی تھیں۔ فرط رنج سے ایک غمزدہ چیخ ان کے منہ سے نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئیں۔ جاوید بھائی کی بے نور پتلیاں انتہائی بیکسی سے تک رہی تھیں۔

اس روز کے بعد کسی نے صفیہ باجی کو ہنستے نہیں دیکھا وہ ہر وقت کھوئی کھوئی اور پریشان سی رہتی ہیں انکے چہرے کا گلابی رنگ اب بالکل پھیکا اور زرد پڑ چکا ہے ان کے حسین و جمیل ہلالی ہونٹوں کی مسکراہٹیں ایک ابدی رنج و غم میں تبدیل ہو گئیں تھیں انکی خوابیدہ سی حسرت بھری نگاہیں ہر وقت کسی کی تلاش کرتی رہتی ہیں انکی زندگی میں ایک ایسا

خلا حائل ہو چکا ہے جس نے مستقبل کی تمام مسرتوں کو اپنی تاریک وسعتوں میں لپیٹ لیا ہے۔ ان کے اردگرد خوشیاں ہیں، مسرتیں ہیں۔ زندگی تھرکتی پھرتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو ہمیشہ تنہا محسوس کرتی ہیں اور یہ احساسِ تنہائی روز بروز ان کی روح کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا ہے۔

اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہماری زندگی میں حادثات کو کتنا دخل ہے، کوئی ایک واقعہ جو دوسروں کی نظروں میں معمولی اور کچھ معنی نہیں رکھتا ہماری زندگی کو کامیاب بنانے یا برباد کرنے میں کتنی قوت رکھتا ہے۔ جاوید بھائی کو مرے ہوئے قریب قریب ایک سال ہو چکا ہے۔ دوسرے لوگوں کی نظروں میں یہ ایک حادثہ تھا۔ جس نے وقتی طور پر ان کی کمزور طبیعتوں میں ایک اضطرابی ہیجان پیدا کر دیا جس سے ان کی سہمی ہوئی نگاہیں اور تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل بے حد متاثر ہوئے مگر اب وہ خوش ہیں یہ حادثہ اب ان کی نظروں میں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ اس کے گہرے نقوش ماضی کے دھندلکوں میں محو ہوتے جا رہے ہیں۔ زندگی پھر شاداں و فرحاں اپنے اسی پرانے دھارے پہ بہہ رہی ہے لیکن اس معمولی سے حادثے کو صفیہ باجی کی زندگی میں کتنا دخل ہے ان کی زندگی پہلے سے یکسر بدل گئی ہے، وہ ہر وقت اداس اور پریشان رہتی ہیں۔ انہیں سب لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے وہ کسی اور دنیا میں پھر رہی ہوں۔ وہ زندگی کی بھیانک راہ پر تنہا چلی جا رہی ہیں ———

درحقیقت ہم سب تنہا ہیں۔ ہم تنہا ہی اس دنیا میں آتے ہیں۔ اور ایک تماشائی یا

اجنبی کی طرح ایک مختصر سے قیام کے بعد خاموشی سے تنہا ہی گزر جاتے ہیں۔ اس قلیل سے عرصہ میں ہیں ہم ہر گھڑی کسی رفیق کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، اوّل تو کوئی ملتا ہی نہیں اور اگر خوش بختی سے کوئی مل بھی جائے تو زندگی کے یہ حادثے اسے کہیں دور پھینک دیتے ہیں۔ اور ہم اس تنہائی میں محیط زندگی کی کٹھن منزل پر آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

صفیہ باجی کی زندگی میں اب کوئی مسرت باقی نہیں ہے۔ ان کے بال ہر وقت پریشان رہتے ہیں۔ خوشنما کپڑوں کی اب انہیں ذرا بھی پروا نہیں۔ وہ بہت کم باتیں کرتی ہیں۔ غم و اندوہ کا ایک ناگوار سا جمود ہمیشہ کے لئے ان کے دل پر مسلط ہو گیا ہے۔ باغ کے اس کنج میں جہاں بہت زیادہ گلاب کی کلیاں ہیں وہ خاموش بیٹھی رہتی ہیں۔ اور وہ خوابیدہ سی آنکھیں ہر وقت کسی کی منتظر رہتی ہیں۔

تبصرے

ج-ک

محمل (مختصر افسانوں کا انتخاب)

ترتیب دینے والے:- موحد بدایونی

نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں۔ قیمت تین روپے۔

اردو ادب میں خواتین کا حصہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اور پچھلے دس بارہ سالوں سے افسانہ نگار خواتین نے جس تیزی اور دلچسپی سے اپنے آپ کو منوانا شروع کیا ہے وہ بھی پوشیدہ نہیں۔ اور اس وقت جب ہمارے سامنے ان عورتوں کے افسانوں کا انتخاب ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اردو ادب میں افسانہ نگار خواتین کی گنتی کتنی بڑھ چکی ہے اور کہ اب ان کے انتخاب کی ضرورت بھی درپیش ہے۔

عام طور پر خواتین کے افسانے گھریلو زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور اس دائرہ میں جہاں جہاں عورت کی نگاہ پڑ سکتی ہے۔ وہ امر افسانے کا باعث ہوا، یا تحریک بن جاتا ہے اور سماجی زندگی کے ایسے پوشیدہ رشتے اور خوفناک شگاف تک عیاں ہو جاتے ہیں۔ جنہیں سماج نے لمبے عرصے تک اپنے دباؤ سے چھپائے رکھا تھا، مگر یہ انداز، اور اتنی جرأت غالباً بہت کم خواتین کے حصہ میں آتی ہے۔ ایک دو کو چھوڑ کر تقریباً تمام افسانہ نگار عورتیں ڈرائنگ روم افسانہ نگاری کی پرستار ہیں اور ان کے خیالات اس حد تک

پوری طرح ... سے مرعوب ہیں کہ وہ اپنے جسم اور اس کی آرائش کے مسئلہ سے زیادہ کبھی نہیں سوچ سکتیں۔ اور جب کبھی وہ اس فریب تصور سے باہر جھانکتی ہیں، تو ان کی تنقید بہت مضحکہ خیز اور سطحی ہوتا ہے۔

محمل میں وہ افسانہ نگار خواتین پیش کی گئی ہیں یہاں دونوں صورتوں میں اعتدال کی مظہر ہیں۔ ان میں دُور، فسادگی، رومان، اور تجسس ہے، گھریلو زندگی کا حسن، موجودہ ماحول کا عکس اور اس پر متوازن تنقید بھی۔ اس اعتبار سے ان افسانہ نگار خواتین کے فن پارے بہت حد تک کامیاب تخلیق ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا پیش لفظ کوئی اتنا اچھا نہیں کہ ہم اسے کتاب کے لئے امتیاز خیال کریں۔ طباعت نفیس، کتابت بہترین ہے فرصت اور تفریح کے لمحات کے لئے محمل کا مطالعہ بہت حد تک اچھا رہے گا۔

ماہنامہ "نسوانی دنیا" - "ہوسائٹی نمبر" ۱۹۴۸ء

کوچہ چابک سواراں، لاہور۔ قیمت دو روپے۔ مدیرہ :- عائشہ صدیقہ

"نسوانی دنیا" کے ادارہ نے جس پالیسی اور جس انداز فکر سے نسوانی دنیا کو مرتب کرنا شروع کیا تھا، اس خاص نمبر میں وہی پالیسی بدستور موجود ہے۔ نئے دور کے تقاضوں اور نئی قدروں کے مقابلہ میں پہلی قدروں اور تقاضوں کو قبول یا رد کرنے، پہلی قدروں کو نئی اقدار کے مطابق ڈھالنے یا پہلی قدروں کو رد کر کے نئی اقدار کو مجسم

اپنانے سے جو مسائل پیدا ہو سکتے ہیں، اور ان مسائل سے عورت کا کس حد تک تعلق ہے یا ہو گا اور وہ کہاں تک ان پیچیدگیوں کی لپیٹ میں آ سکتی ہے اور انہیں پیچیدہ تر کرنے یا حل کرنے میں اس کا ہاتھ بٹانا ہو۔ یہ وہ موضوع ہے۔ جو اس رسالہ کو خواتین کے دوسرے اخباروں اور رسالوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ "بہو ساس نمبر" بہت حد تک انہی مسائل کا آئینہ دار ہے

بہو ساس نمبر اس مسئلہ کو پیش کرتا ہے کہ ہر قسم کی برائی جاگیرداری نظام سے پھوٹتی ہے۔ اس لئے اس نظام کا استیصال سماجی برائیوں کا خاتمہ ہو۔ "نسوانی دنیا" ان مسائل کو بالعموم اور اس نمبر میں عورتوں کے اس مسئلہ کو بالخصوص پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ مگر اس کامیابی خلوص اور سنجیدگی کے باوجود یہ سمجھنا ناگزیر ہے کہ نسوانی دنیا عورتوں کا پرچہ نہیں بلکہ عورتوں کے مسائل کو مردانہ نقطہ نظر سے جانچنے کے لئے ایک معیار ہے۔ اس میں ایک نئی عورت ضرور ہے، مگر وہ عورت جو سماج کے جسم سے خود بخود پیدا نہیں ہوئی بلکہ پیدا کی جا رہی ہے اور جس کے متعلق پیشگوئی ہے۔ کہ وہ توانا ہو گی اور صحت مند ہو گی۔

ماہنامہ "آموزش" ۔ کشمیری بازار لاہور ۔ ایڈیٹر: بشیر ہاشمی ۔ قیمت درج نہیں ۔

یہ تعلیمی ماہنامہ ہے اور تعلیمی ماہ نامہ ہونے کی حیثیت سے اس کے موضوع اور مضامین [illegible] ملتے ہیں۔ مہذب دنیا کی تعلیمی حالت اور خصوصاً اسلامی ممالک میں تعلیم تدریس کے متعلق معلوماتی مضامین اس ماہ نامہ کو انفرادیت بخشتے ہیں۔ رسالہ پڑھنے کیلئے اور خصوصاً تعلیمی ماحول سے واقفیت رکھنے کے لئے بہت اچھا ہے۔

آموزش کے کارپردازان کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے کہ اس میں مسائل تعلیم پر ٹھوس فہیم اور عالمانہ مضامین شائع کئے جاتے ہیں، پاکستان کے تعلیمی مسائل کو سلجھانے میں یہ رسالہ کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے اسکا فیصلہ مستقبل کریگا، بہرحال اسکی ابتداء سے اسکی انتہا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ماہنامہ "پرچم" - لائل پور - ایڈیٹر:- شاکر عروجی

اس ادبی ماہنامے کی اٹھان ایک روشن مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔ چند ایک خامیوں کے باوجود رسالہ کی تدوین و ترتیب اچھی ہے۔ البتہ مضامین اور افسانے ایک عام پڑھنے والے کے معیار سے کچھ بلند نہیں۔ اگر ادارہ نے اپنے معیار کو متعین نہ کیا تو اغلب ہے کہ یہ ماہنامہ بھی سستے ادب کے دوسرے رسالوں کی طرح اپنی اس اٹھان اور عزم کو برقرار نہ رکھ سکے۔

ہفت روزہ "فرض" - لاہور - ایڈیٹر:- ظفر احمد - چندہ سالانہ بارہ روپے

پہلی جلد کا چوتھا شمارہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ جہاں تک اس شمارے کا تعلق ہے، ہمارا خیال ہے کہ اس کا معیار عام ہفت روزہ اخبارات سے بلند ہے۔ موضوع متنوع ہیں، سیاسیات، ادبیات اور معلومات، اس شمارے کے چند نمایاں عنوان ہیں۔ ادارہ نے اپنی طرف سے اسے جاذب اور دلکش اور دلچسپ بنانے کی پوری پوری کوشش

[illegible] کے قاری کے لئے مناسب مواد پیش کیا ہے۔ عورتوں سے متعلق [illegible] بچوں کے لئے بھی علیحدہ کا[illegible] ہے۔

ہفتہ روزہ "صدائے نسواں" - لاہور

ایڈیٹر:- انور بزمی۔ چندہ سالانہ بارہ روپے

عورتوں کا یہ اخبار بھی کسی حد تک اچھا ہے۔ مسئلے اور مسائل، زندگی اور [illegible] کے سوالات، کہانیاں، نظمیں اور غزلیں، سب ملکر رسالہ کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ طباعت اور کتابت معمولی۔ سرورق رنگین ہے۔

پندرہ روزہ "دعوت"۔ کراچی

ایڈیٹر:- محمد عبدالرشید عزیز۔ چندہ پانچ روپے

اسلامی نقطۂ نظر سے عصرِ حاضر کے ہر مسئلے اور موجودہ تہذیب سے پیدا ہوئی ہر بیماری کا علاج اسلامی معاشرہ کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ اخبار ہمارے سماج کے اس طبقہ کے پڑھنے کے لئے بہت مناسب ہے جو پرانی قدروں کی پختگی پر بہت یقین رکھتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کے اپنے مضمون "اسلامی انقلاب" میں ایک جوش، بحران اور انتہا پسندی ہے۔ رسالہ کی تدوین، کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

بہ کار ۱۲۶ اگست ۱۹۴۸ء

معرکۂ ذہن و بدن

تحریک سوشلزم پر ایک نظر

میرزا محمد حسین صاحب ابی کا کام

سوشلزم کی تاریخ اس انقلابی تحریک کے مشاہیر اور اس کے مختلف مذاہب فکری کو نہایت مؤثر اور عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سوشلزم پر نہایت بلند پایہ تصنیف ہے۔

ادارۂ ادبیات جدید مسلم سٹریٹ سرکلر روڈ لاہور

١٢٧

اگست ۱۹۳۶ء

(زیر طبع)

...ں کی انقلابی تحریکیں

مصنفہ

مولینا اظہر امرتسری

صاحب طرز مصنف اور کہنہ مشق اخبار نویس جناب مولینا اظہر امرتسری کی انقلاب آفرین اور بلند پایہ تصنیف ——

نمبر ادارۂ ادبیات جدید مسلم سٹریٹ سرکلر روڈ لاہور

جنگل

(زیر طبع)

میرزا ادیب کے
افسانوں کا مجموعہ

جو میرزا ادیب کی افسانوی ٹیکنیک کی خصوصیات کا آئینہ دار ہے

کتابیں

اردو ادب کی جدید معیاری مطبوعات ادارۂ ادبیات جدید
سے طلب کریں سب کتابیں ایک ہی مرکز سے طلب کرنے میں
آسانی رہتی ہے اس میں آپ کا بھی فائدہ ہے۔

منیجر ادارۂ ادبیاتِ جدید مسلم سٹریٹ سرکلر روڈ لاہور